یادگارِ داغ

ایڈیٹر
شیخ عبد القادر بی۔ اے بیرسٹر

یعنی

مخزن

بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۰۵ء
جلد (۹)۔ نمبر ۱

مضامینِ نثر

ساحل کی سیر۔ شیخ عبد القادر (از لنڈن)۔ ۱
مرحوم شاہ اودھ کے خطوط۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۱
زندہ دلی۔ محمد عزیز مرزا بی۔ اے ڈپٹی کلکٹر (دہلی) ۱۴
کلامِ داغ۔ سیر نیرنگ بی۔ اے ۲۰
انسان و انسانیت۔ ملبدم (از بغداد) ۳۵
وادیٔ خیال کا شیدا۔ خواجہ لطیف احمد بی۔ اے ۳۸

مضامینِ نظم

داغ۔ شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ ۴۴
کلامِ اکبر۔ خان بہادر سید اکبر حسین جج۔ ۴۶
ترکیب بند (مرثیہ داغ مرحوم) سید علی حسن احسن مارہروی۔ ۴۸
تسکینِ قلب۔ مولوی سید علی سجاد عظیم آبادی ۵۷
داغ کے پھول۔ منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی ۵۹
تازہ غزلیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۴

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں
○ شہروں میں اردو مادری زبان ہے۔ ☐ ان شہروں میں اردو مروج ہے۔ ⊕ ان شہروں میں سمجھی جاتی ہے۔

شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر نے مطبع خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور
میں چھپوا کر شائع کیا۔

قیمت سالانہ محصول ڈاک قسم اول للعہ فی پرچہ ۸ قسم دوم (عہ) فی پرچہ ۳

موت کا خوفناک نظارہ - ہر طرف سے لوگوں کی آہ وزاری اپنی
نوجوانی - عورت اور بچوں کی بیکسی کا خیال مجھے پریشان کئے جاتا ہے
ہر ایک آدمی زندگی سے بیزار - موت کا منظر دکھائی دیتا ہے - کچھ
نہیں سوجھتا کیا کروں کہاں جاؤں کدھر بھاگوں ہر طرف
موت منہ پھاڑے کھڑی ہے ÷
فرشتہ :- او بزدل بیخبر
انسان! اتنا مت ڈر -
ہوش و حواس کو قائم رکھ کر میری بات کو غور سے سن کہ بھاگنے کی ضرورت نہیں

مخزن

(19167)

ساحل کی سیر

انگریزوں کو چونکہ ایک جہاز راں قوم بننا اور جہاز رانی میں نام پیدا کرنا تھا۔ اِس لئے قدرت نے اس مقصد کے حصول کے اسباب اُن کے گرد وپیش ڈالدیئے۔ اوّل تو اُن کو پیدا کیا ایسی جگہ جس کے چاروں طرف پانی ہو۔ دوسرے پانی کی محبّت اُن کے دِل میں پیدا کر دی۔ ہندوستان کے اُن حصّوں کے باشندے جہاں سمندر تو ایک طرف دریا بھی بہت قریب نہیں ہوتے۔ اور بڑے سے بڑا پانی کا ذخیرہ گانو کا تالاب اور بہتر سے بہتر نہانے کا موقعہ نہر کی شاخ ہوتی ہے۔ کیا جانیں۔ کہ انگریزوں کی زندگی میں پانی کے قریب رہنے۔ بلکہ اکثر پانی کے اوپر یا پانی کے اندر رہنے نے کیسا انقلابِ عظیم پیدا کیا ہے اور اُن کی جراءت۔ ہمّت۔ چستی اور اعصابی قوّت میں اس جزو کا کتنا اثر ہے۔ بابر بادشاہ کا ایک قول مشہور ہے۔ کہ جب وہ ہندوستان میں آیا تو اُسے سب سے زیادہ حیرت یہ دیکھ کر ہوئی۔ کہ اگر کوئی ہندی امیر اتّفاق سے دریا کے کنارے خیمہ لگاتا تھا۔ تو عموماً اُس خیمے کی پُشت دریا کی طرف ہوتی تھی۔ اور بابر اور اس کے ہمراہی پانی کے نظارے پر مرتے تھے۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پانی کے کنارے ڈیرے ڈالتے تھے۔ اور لبِ دریا بیٹھ کر روانیِ آب کے مزے لیتے اور دادِ کامرانی دیتے تھے۔ مزاج کے اس قدرتی فرق

نے جو بظاہر مذاق کا ایک معمولی فرق معلوم ہوتا ہے۔ قسمتوں میں اتنا فرق ڈالدیا۔ کہ بابر اور اُس کے ہمراہی حاکم بنے اور دریا کی طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھنے والے محکوم۔ جب تک بابر کی نسل ہندوستان میں حکمراں رہی۔ اُن میں اپنی جد کے مزاج کا وُہ حصّہ برابر موجود رہا زمانے نے اُن کی طبیعتوں میں کئی انقلاب پیدا کئے۔ نئی نئی ملکی رسُوم نے اُن کے ہاں دخل پایا۔ زبان بدل گئی۔ مگر ہائے رے پانی کے نظارے کا عشق! یہ وہ سودا تھا کہ دماغ سے نہ گیا۔ محل بنائے تو دریا کے کنارے سربفلک قلعے تعمیر کئے تو لب دریا۔ مسجدیں بنائیں تو پانی کے قریب اور اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ مرکر بھی اس شوق سے چھٹکارا نہ ہوا۔ مقبرے کے لیے بھی قُربِ آب کی جستجو ہوئی۔ یہی مذاق جہانگیر کو آئے دِن سفرِ کشمیر پر آمادہ رکھتا تھا اور اسی مذاق کا اثر شاہجہان کے شوق تعمیر کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ کاش انہیں کوئی سمندر کا بھی مزا چکھا دیتا۔ اور ہمیشہ اندرونِ بر پانی کے چھوٹے چھوٹے تختے تلاش کرنے کی بجائے پہنائے بحر سے اُن کی آنکھ آشنا ہو جاتی۔ تو عجب نہیں اُن کے خاندان کی تاریخ کچھ اَور ہوتی۔ یہ باتیں معلوم تو خفیف ہوتی ہیں۔ مگر اِن کا اثر قومی خصائل پر قدرت کے بعض باریک قوانین کے متعلق ہے جو مشکل سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ مگر جو اپنے نتائج دکھائے بغیر نہیں رہتے

اِنگلستان میں اگر کسی مسافر نے انگریزوں کی آب پرستی کو نہیں دیکھا تو وُہ یہاں کی زندگی کی آدھی بہار سے محرُوم ہے۔ اس کا سب سے پہلا ثبوت تو یہاں کے شہروں کی آبادی کی طرز میں ملتا ہے۔ لنڈن ہی کو لیجئے۔ دریائے ٹیمز اس کی آدھی رونق ہے۔ شہر کے بیچ میں بل کھاتا ہُوا جا رہا ہے اور دریا کے اِس پار اور اُس پار دونو طرف آبادی ہے۔ ہندوستان میں کشمیر والے چاہیں تو سری نگر میں ایک چھوٹے سے پیمانے پر یہ نقشہ پیدا کر سکتے ہیں۔ مگر انہیں مقامی جھگڑوں سے کہاں فرصت۔ لنڈن کے بہت سے بڑے بڑے مقامات لب دریا واقع ہیں۔ پارلیمنٹ کی عمارت مگر شاندار تعمیر کی بُنیاد کو تو ٹیمز ہر وقت ادب سے بوسہ

دے کر گذرتا ہے - اُس کا تو ذکر ہی کیا - کئی اچھے کلب گھر اور ہوٹل ایسی جگہ بنائے گئے ہیں - کہ اپنے کمروں میں بیٹھ کر کھڑکی سے آبِ رواں کی بہار لوٹئے - لندن سے باہر علاقے میں دریا کے کنارے کنارے سفر کرو اور منبع کی طرف چلو تو دونو طرف آبادی چلی جاتی ہے - اور کئی گھر تو ایسے ہیں کہ اُن کے باغ سے نکل کر چار سیڑھیاں اُتریں تو دریا میں جا پہنچیں - وہاں اُن گھروں کے رہنے والے موسمِ گرما میں کُرسیاں بچھا کر بیٹھتے ہیں اور گزرِ آب کا تماشا کرتے رہتے ہیں - سیڑھیوں کے نیچے ہر ایک صاحبِ توفیق کا ڈونگا بندھا رہتا ہے - تاکہ جب جی چاہا اُتر کر دریا کی سیر کو نکل گئے - کشتی کو کھینے کے لئے کشمیر کی طرح نوکر نہیں رکھتے - بلکہ اچھے اچھے امیر خود اپنے ہاتھ سے کھیتے ہیں - عورتیں ساتھ ہوں - اور عموماً ہوتی ہیں - تو مرد کا فرض ہے کہ انہیں تکلیف نہ دے - بلکہ خود کھینا فخر سمجھے - لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عورتیں اپنی تفریح یا ورزش کے لئے خود کھینا چاہتی ہیں اور اسی شوق اور دیگر مردانہ ورزشوں اور کھیلوں میں ان کی حیرت انگیز نمو اور تندرست اور بشاش چہروں کا راز چھپا ہے - انگلستان کا قریب قریب ہر بڑا شہر یا سمندر کے کنارے یا کسی دریا کے کنارے آباد ہے - یہاں کے دونو مشہور تعلیمی مرکز کمبرج اور اکسفورڈ اسی کلیہ کی مثالیں ہیں - گو دریائے کم جس سے کمبرج کا نام نکلا ہے - ایک چھوٹی سی ندی ہے - تاہم کمبرج کی خوبی میں اس کا کچھ کم حصہ نہیں - اکثر کالج لبِ دریا بنے ہیں - اُن کے کُتب خانوں میں بیٹھے دریا کی طرف جھانک لو اور جی چاہے تو عقب کالج جا کر چند سیڑھیاں اُتر جاؤ اور کشتی چلانے لگو - یہ نمونہ شمالی انگلستان بلکہ سکاٹلنڈ تک چلا گیا ہے اور اہلِ برطانیہ کا یہ شوق ہر جگہ ظہور پذیر ہے - ہمارے ہاں صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں چند شہر گنگا اور جمنا کے کنارے واقع ہیں - اور دو تین میں کچھ حصہ آبادی کا عین لبِ دریا تک پہنچ گیا ہے - مگر دوسری طرف عموماً خالی ہے - اور دریا کے وجود سے ہرگز اتنا یا اس قسم کا فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا - اگر کوئی چیز کسی کو دریا کی طرف کھینچتی ہے تو مذہبی شوق یا مذہبی فرض اور دریا کی توقیر محض اس لئے

کہ وہ قدرت کا ایک دلچسپ اور دلکش کرشمہ ہے۔ اس سے مستفید اور محظوظ ہونا ہمارا استحقاق ہے بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

دریاؤں اور اُن کی سیر کی عمومیت کا ذکر تو اہلِ انگلستان کے شوق نظارۂ آب کے ضمن میں آگیا۔ مگر ہمارا اصلی مقصود تو اُس شغف کا بیان کرنا ہے جو یہاں کے باشندوں کو سمندر اور اُس کے کنارے کی سیر کے متعلق ہے۔ ساحل کی سیر یہاں ضروریات میں سمجھی جاتی ہو۔ اور ساحل پر پہنچکر جو طریق زندگی اختیار کیا جاتا ہو وُہ اندرونِ مُلک کے شہروں کے طریق روزمرہ سے بہت کچھ جُدا ہے۔ مثلاً سفر میں خموشی اور بلا تعارف کسی سے گفتگو کرنے سے پرہیز انگریزوں کے مشہور خواص میں ہو۔ وُہ اصحاب جو ہندوستان میں ریل گاڑی میں بیٹھتے ہی ہمسفر سے مخاطب ہو کر سوالات بے پایان کا دفتر کھولنے کے عادی ہیں۔ سخت گھبرائیں۔ اگر انہیں یہاں کسی انگریز کا ہم سفر ہونا پڑے۔ گھنٹوں کا ساتھ ہے۔ مگر ایک دُوسرے سے کوئی بات نہیں کرتا۔ لیکن ساحل کی سیر میں یہ قاعدہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہاں ہر شخص تفریح کے لئے۔ یا شوقِ صحت میں جاتا ہے۔ کاروبار سے فراغ حاصل ہوتا ہے۔ اور دن بھر کا ٹنا ہوتا ہے۔ پس سب کی آسانی کے لئے یہ اصُول قرار پاگیا ہو کہ اگر وہاں کوئی کسی سے بلا تعارف بھی بات چیت شروع کردے تو مضائقہ نہیں۔ تھوڑی سی مُلاقات ہُوئی۔ تو ملکر سیر کو نکلنا۔ اکٹھے کشتی میں جانا یا اکٹھے نہانے جانا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس میں بے تکلف بات چیت کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس سیر کا مزا دیکھنا ہو تو موسم گرما میں دیکھو۔ یہ پانی کے کیڑے سمندر میں یُوں پیرتے پھرتے ہیں جیسے بڑی بڑی سفید مچھلیاں۔ تھوڑی بہت مشق تو ہر زن و مرد بچے بُوڑھے کو ہے۔ مگر بعض تو کمال کرتے ہیں۔ شرطیں بد کے میلوں تک پیرتے نکل جاتے ہیں۔ اگر سینکڑوں پیر رہے ہیں تو ہزاروں کنارے پر بیٹھے تماشا دیکھتے ہیں۔ ساحلِ بحر کی سادگیٔ وضع کی یہاں انتہا ہو جاتی ہے۔ اچھی اچھی تعلیم یافتہ لیڈیاں اپنی اچھی پوشاکوں سمیت اور اُن کے خوشپوش ہمراہی جنٹلمین کنارے کے ریتے پر جو بیشمار چھوٹے چھوٹے کنکروں سے ڈھپا ہوتا ہے بیٹھ جاتے

ہیں۔ نہ کپڑوں کے خراب ہونے کی پروا ہوتی ہے۔ نہ اس طرح زمین پر بیٹھنے میں کوئی کسرِ شان سمجھی جاتی ہے۔ بچے ایک دوسرے پر کنکر برساتے ہیں اور سمندر کی ہوا میں کچھ ایسی روح افزائی ہے کہ بڑے بوڑھے بھی دم بھر کے لئے بچے بن جاتے ہیں اور اس کھیل میں شریک ہو لیتے ہیں۔ جہاں یہ ہجوم ہوتا ہے۔ وہاں کشتیوں والے آکر شور مچاتے ہیں اور لوگوں کو کشتی کی سیر کے لئے بلاتے ہیں۔ جن لوگوں کو کشتی چلانے کی مشق ہے وہ یہاں بھی کشتی کرایہ کرکے اور اپنے دوستوں کو ساتھ لیکر اسے خود چلاتے ہیں اور جنہیں پوری مشق نہ ہو۔ یا ساری کشتی نہ لے سکیں وہ کشتی بان کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کوئی شوقین ہیں کہ کنارے پر بیٹھے ہوئے آتی جاتی کشتیوں کی تصویر لے رہے ہیں۔ کوئی صاحب مچھلی پکڑنے کے جال یا کانٹے لیکر کشتی میں جاتے ہیں اور اس شغل سے اپنا جی بہلاتے ہیں۔ غرض دور تک کنارے پر اسی طرح رونق چلی جاتی ہے۔ بعض مقامات ایسے سیر حاصل بنائے گئے ہیں۔ کہ دھوپ کے وقت کے لئے کنارے کے قریب سایہ دار سڑکیں اور روشیں موجود ہیں۔ جہاں لوگ چل پھر سکتے اور بیٹھ سکتے ہیں۔ آبادی بلندی پر ہے اور اسکی حفاظت یا تو قدرت نے ہی چٹانوں کے ذریعے کردی ہے۔ یا صنعت نے بڑے بڑے مضبوط بند بنا دیئے ہیں۔ اس بلندی پر کنارِ بحر کے متساوی ایک سڑک ہوتی ہے۔ جو سیر کے دنوں میں صبح شام مرجع انام ہوتی ہے۔ اس سڑک پر باجے کی جگہ بنی ہوتی ہے۔ جہاں لوگ بیٹھ کر باجا سنتے رہتے ہیں۔ یا اور تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ جنہیں ٹکٹ دیکر دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ان تماشوں میں اکثر عوام کا جمگھٹ رہتا ہے۔ معقول پسند لوگ قدرت کے تماشوں اور کھلی ہوا کو ان مشاغل پر ترجیح دیتے ہیں۔

ساحلِ بحر پر اکثر بھوک خوب لگتی ہے۔ اور وجوہ اس کے ظاہر ہیں۔ کام سے نجات صحت بخش آب و ہوا۔ اس پر ورزش و تفریح۔ پھر سوائے کھانے کے اور کیا سوجھے۔ وہاں کے جو مقیم لوگ ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں۔ جنکی وجہ معاش یہی ہے۔ کہ سمندر کے نظارے کے شائق

جوائیں۔ اُن کے قیام کا انتظام کریں۔ ان گھروں میں بعض اوقات عجیب مجمعے ہوتے ہیں شہر در سے ہر مذاق اور ہر فن کے لوگ آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگرچند مختلف معنوں کے ماہر اتفاق سے ایک گھر میں جمع ہو جاویں۔ تو شام کو کسی تماشاگاہ میں تفریح کے لئے جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ گھر کا کمرہ ہی ایک تماشاگاہ بن جاتا ہے۔ جس میں ہر شخص اپنا کمال دکھاتا اور اپنے رفقا کی تفریح کے سرمایے میں اپنا حصہ دیتا ہے۔ عام دستور ان گھروں کا یہ ہے۔ کہ صبح کو وقت مقررہ پر سب ایک میز پر چاشت کھاتے ہیں۔ اُسی میں ہر شخص اپنے اپنے رُفقا سے تصفیہ کر لیتا ہے۔ کہ کہاں کی سیر ہو۔ اُسی قرارداد کے مطابق باہر نکلتے ہیں اور پھر دوپہر کے بعد کھانے پر جمع ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنے حالات کہتا ہے اور ایک دُوسرے سے پوچھنا کہ آپ نے آج کیا کیا دیکھا اور کس مشغلے میں وقت گزارا اخلاق میں داخل ہوتا ہے۔ کوئی کہتا ہے "میں تو سارا دن پانی پر رہا" یعنی کشتی کی سیر کی۔ کوئی بتاتا ہے "ہم تو دو گھنٹے پانی میں رہے" یعنی نہاتے تیرتے اور غوطے لگاتے رہے۔ کوئی بیان کرتا ہے ہم تو گاڑی پر بیٹھ کر کنارے ہی کنارے کئی میل تک سواری کو نکل گئے تھے۔ کسی نے کنارے کے کنکروں پر وقت گزارا۔ اور کسی نے سایہ دار سڑکوں کی سیر کی۔ مگر ان سب بیانوں میں مشرقیوں کے لئے بہت کچھ تعجب خیز بیان وُہ ہے جو بہت سے پُر رونق ساحلی مقامات میں عام ہوتا جاتا ہے اور جس کا نام "مکسڈ بیدنگ" یعنی غسل مخلوط رکھا گیا ہے۔ ہر شخص سوال کرتا ہے۔ کہئیے "مکسڈ بیدنگ" میں گئے تھے یا نہیں۔ اور کہتا ہے ہم گئے تھے ہمیں تو بڑا لطف آیا۔ اس میں زن و مرد یکجا نہاتے ہیں۔ نہانے کے کپڑے خاص بنے ہیں۔ جو مردوں کے لئے ہیں۔ وُہ صرف وسط بدن کو ڈھانپتے ہیں اور جو عورتوں کے لئے ہیں وُہ وسط بدن اور سینے کو۔ باقی سارا بدن ننگا ہوتا ہے اور اس ہیئت کذائی میں یہ مُدعیانِ شائستگی دریا میں کُود پڑتے ہیں۔ غیر مرد اور غیر عورتیں۔ جان نہ پہچان۔ پاس پاس نہا رہے ہیں

تیر رہے ہیں۔ غوطے لگا رہے ہیں۔ اور اس حالت میں ایک دُوسرے پر پانی پھینک دینا یا آپس میں ہنس بول لینا کچھ ایسا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ چاہے پانی سے نکل کر کپڑے پہنتے ہی پھر ایک دُوسرے سے بیگانے بن جائیں۔ جیسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ دستور یا تو انگلستان کے زمانہ جاہلیت کا بقیہ ہے۔ جواب پھر تازہ ہونے لگا ہے۔ یا اُس خوفناک سُرعتِ رفتار کا نتیجہ ہے جس کے ساتھ عورت کی آزادی کی رَو مغربی دنیا میں چل رہی ہے۔ بہر حال یہ حصہ ساحل کے مشاغل کا ہرگز اس قابل نہیں۔ کہ کوئی اس کی نقل کرنا چاہے۔ گو یہاں یہ کیفیت ہے کہ جن مقامات میں یہ مروّج ہے۔ وہاں کے ہوٹلوں والے اخبارات میں اُس مقام کے قدرتی نظّاروں اور صحت بخش اثرات کا ذکر کرتے ہُوئے ترغیب کے لئے یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ یہاں "غسلِ مخلوط" مروّج ہے۔

دوپہر کا کھانا ختم کرتے ہی لوگ پھر گھروں سے نکلتے ہیں اور اُسی طرح اپنی اپنی پسند کے مشغلوں میں وقت بسر کرتے ہیں۔ کوئی ذوقِ مطالعہ میں سرشار ہُوتے ہیں۔ کتاب لیکر دُور نکل جاتے ہیں۔ جہاں آمد و رفت تو ہو کم۔ مگر جنگل بھی نظر آئے۔ سمندر بھی نظر آئے اور ہوا بھی صاف ہو۔ گھاس پر بیٹھ جاتے یا لیٹ جاتے ہیں اور کتاب پڑھتے رہتے ہیں۔ کوئی ایسے ہوتے ہیں کہ اور کوئی نہ ملا تو کتاب لے لی۔ مگر زندہ یا حاضر جلیس کو مُردہ یا غایب جلیس سے قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں۔ غرض "ہر سرے وہر سودائے"۔ ہر ایک اپنی دھن میں لگا ہوتا ہے۔ اور اس تفریح کے جتنے دن ملیں انہیں غنیمت سمجھتا ہے۔ کئی مہینوں رہتے ہیں۔ کئی ہفتوں۔ مگر ایسا تو کوئی ہی خدا کا مارا ہوتا ہوگا۔ جو چند دن کے لئے سمندر کی ہوا سے اپنا دماغ تازہ نہ کر آئے۔

یہ تو تھی گرما کی کیفیت۔ مزا یہ ہے کہ اُمرا اور خوشحال لوگ سرما میں بھی وہیں جاتے ہیں گو سرما میں وُہ چہل پہل اور وُہ رونق نہیں ہوتی۔ پھر بھی جو لوگ شہروں کی دُھند اور غبار سے

گھبرا جاتے ہیں اور سردی کی کثرت سے تنگ آ تے ہیں۔ وہ ساحل بحر کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ جہاں دھندے عموماً نجات ہوتی ہے اور جہاں انگلستان کے جنوبی حصے میں جاڑے میں بھی آب و ہوا معتدل سی رہتی ہے۔ اسی لئے جنوبی ساحل کو "سنی ساؤتھ" یعنے آفتاب سے روشن جنوب کہتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ بہار انگلستان میں جنوبی دروازے سے داخل ہوتی ہے جن کے پاس دولت یا فرصت اس قدر ہے کہ انہیں سال بھر میں سوائے موسموں کے "تغیر" پر خوشی یا افسوس کرنے کے کچھ کام نہیں۔ وہ بہار کے خیر مقدم کے لئے جنوب کو تشریف لے جاتے ہیں۔ مصروف اور محنتی اصحاب چاہے ایسی مسلسل تفریح کو نظر حقارت سے دیکھیں۔ مگر انگلستان کی مجموعی تمدنی حالت کے بنانے میں ان بظاہر بیکار لوگوں کا بھی حصہ ہے۔ اور عیب چاہے ان میں کتنے ہوں۔ ان کی اس خوبی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ سمندر اور پانی کے دلدادہ ہونے میں یہ اپنی قوم کے کسی دوسرے حصے سے کم نہیں اور کھیل ہی کھیل میں اتنی مہارت بہم پہنچائے ہوئے ہیں۔ کہ ضرورت کے وقت کسی ڈوبتے کو بچانے۔ کسی گرتے کو سنبھالنے کے لئے بھی اسی آسانی سے پانی میں کود پڑتے ہیں۔ جس سے اپنی تفریح کے لئے غوطہ زنی کرتے ہیں اور جب تک انگلستان کی بڑائی بحری طاقت پر منحصر ہے اس وقت تک قوم میں اس عام مذاق کو قائم اور تازہ رکھنے والے بیکار نہیں سمجھے جا سکتے۔

کچھ عرصہ ہوا۔ یہاں البرٹ ہال میں ایک بڑا جلسہ تھا جس میں ایک مشہور یتیم خانے کی کئی سو لڑکیاں اور کئی سو لڑکے موجود تھے۔ لڑکوں کا ایک گروہ بحری وردی پہنے ہوئے قواعد کرتا ہوا حاضرین کے سامنے آیا۔ اور چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ایک گروہ کثیر نے ننھی ننھی پیاری پیاری آوازوں میں ایک گیت گایا۔ جس میں انگلستان کے لوگوں کے اس شوق کا اظہار بڑے پُرزور اور موثر طریقے میں کیا گیا ہے۔ اس گیت میں ایک خوبصورت لڑکی اپنے چاہنے والے نوجوان کو خطاب کر کے کہتی ہے۔ "سمندر کی خدمت میں جا میری جان" یہ الفاظ اس گیت

میں ہر چار مصرعوں کے بعد دُہرائے جاتے تھے اور عجب تاثیر پیدا کرتے تھے ۔ وُہ سماں مدتوں نہیں بھولے گا ۔ کیونکہ اُسے دیکھ کر یہ عقدہ حل ہوتا تھا کہ وُہ کونسی چیز ہے ۔ جو اس قوم کے اتنے افراد کو بحری خدمت اختیار کرنے کی طرف مائل کرتی ہے ۔ یہ گیت اُن گیتوں کا نمونہ تھے جن سے عرب خواتین اپنے شجاع شوہروں کی ہمت بڑھایا کرتی تھیں ۔ کہاں ہیں وُہ پاک دل اور پاک طینت گانے والیاں اور کہاں ہیں وُہ قدر دان سُننے والے ۔ جو جانیں لڑا دیتے تھے ۔ کہ گھر جائیں تو سُرخرو جائیں ۔ ورنہ میدان میں کام آئیں ۔ دُنیا ایک عالم خواب ہے گذشتہ قوموں کی عظمت کی اب صرف داستانیں رہ گئی ہیں ۔ اور آج جن کی نوبت ہے ۔ وُہ اپنا فرض ادا کر رہی ہیں اُس گیت کا مفہوم اگر کسی قدر آزادی کے ساتھ اُردو میں ادا کیا جائے ۔ تو مندرجہ ذیل اشعار سے مطلب نکل آتا ہے :-

سمندر کی خدمت میں جا نا مری جاں

سمندر کی خدمت میں جانا مری جاں اسی میں ترقّی کا ہے راز پنہاں
اسی سے بڑھی ہیں جو ہم میں بڑھی ہیں اسی کے سہارے ہم اکثر لڑے ہیں

سمندر کی خدمت میں جانا مری جاں

تجارت ہماری سمندر کے بل پر حکومت ہماری سمندر کے بل پر
اسی سے یہ دولت یہ ثروت ہماری نہ کیوں کر ہیں اس کی موجیں ہوں پیاری

سمندر کی خدمت میں جانا مری جاں

اسی سے کیا نام نیلسن[۵۱] نے پیدا اسی پر ہراہم سے تھا آرمیڈا[۵۲]

---

۵۱ انگلستان کے مشہور امیر البحر کا نام ۔

۵۲ جنگی جہازوں کا وُہ بیڑا جو ہسپانیہ نے انگلستان پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا تھا ۔ مگر جس کی شکست کی تاریخ سے ہسپانیہ کی بحری طاقت کا خاتمہ اور انگلستان کی بحری قوت کا آغاز ہوا ۔

اِسی سے زمانے میں ہے دھاک اپنی   اِسی سے بنی قوم بے باک اپنی

سمندر کی خدمت میں جانا مری جاں

کہاں ہم کہاں مُلک ہندوستاں تھا   سمندر کا رشتہ مگر درمیاں تھا
سمندر نے دُوری کو کیسا مٹایا   پھریرا ہمارا کہاں جا اُڑایا

سمندر کی خدمت میں جانا مری جاں

اگر چاہو تم مجھ کو اپنا بنانا   سمندر کی خدمت سے دل مت چرانا
محبت وطن کی دکھاؤ تو جانوں   اگر مُلک سے دل لبھاؤ تو مانوں

سمندر کی خدمت میں جانا مری جاں

سمندر سے جب نام کر کے پھرو گے   وطن کا کوئی کام کر کے پھرو گے
تو میں بھی فدا جان تم پر کرونگی   تمہاری ہمیشہ کو میں ہو رہوں گی

سمندر کی خدمت میں جانا مری جاں

اگر لڑتے لڑتے گئے خود بھی مارے   سمندر میں اگلے جہاں کو سدھارے
منگیتر بہادر کی پھر میں بنوں گی   تمہیں اگلی دُنیا میں جلدی ملوں گی

سمندر کی خدمت الخ

عبد القادر (از لندن)

ارکان الاسلام

اس کتاب میں منشی سراج الدین احمد صاحب ایڈیٹر اخبار زمیندار نے مُسلمان انگریزی خوان بچوں کے لئے اسلام کے پنج ارکان یعنی توحید و رسالت نماز و روزہ حج زکوٰۃ کی حنفی طریق پر تشریح کر کے فلسفہ جدیدہ کی رُو سے اُنکی خوبیاں لکھی ہیں۔ اُردو زبان میں فقہ کی یہ کتاب اپنی مثال ہے۔ زبان ایسی سلیس ہے کہ بچے بہت آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ اپنے مذہب سے واقفیت حاصل کرنیکے لئے اسکا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت ۵

مینجر اخبار زمیندار کرم آباد (تحصیل وزیرآباد) سے طلب فرمایئے۔

مرحوم شاہ اودھ کے خطوط

اودہ میں شاہی کا چراغ گل ہوچکا تھا۔ اور شاہانِ اودہ کا آخری جانشین اپنے دار الحکومت سے باہر کلکتے میں اسیرِ سیاسی تھا۔ انقلاب تھا اور کیسا بڑا انقلاب۔ تخت اور لکھنؤ کا سا تخت۔ شاہی اور اودہ کی شاہی۔ اُس میں مشرقی تنعم اور عیش پسندی اور وہ اُس انتہائی درجے کی جو مرحوم واجد علی شاہ کے جدت پسند دماغ کا نتیجہ ہو۔ اِس بلندی سے گرنا اور کہاں۔ اسیری میں اور ایسے زمانے میں جب کہ غدر کے حوادث نے انگریزوں کے دل پتھر کردیئے تھے۔ اُس پر جو گذری ہوگی کوئی کیا اندازہ کرسکتا ہے۔ اُسی کا دل اُس درد سے آگاہ ہوسکتا تھا۔ اُس دلِ داغدار کی چند تصویریں ہمیں ملی ہیں جن میں سے ایک آج پیش کی جاتی ہے:۔

محلاتِ شاہی میں ایک چہیتی بیگم تھیں۔ ممتاز جہاں اکلیل محل زینت بیگم۔ جسے لکھنؤ بیٹھ کر اپنے دلدادہ شوہر کے فراق کے صدمے جھیلنے پڑے۔ دونوں کے زمانۂ ہجر کا اگر کچھ مشغلہ تھا تو یہ کہ خطِ شوق بھیجکر اُس کے جواب کے منتظر رہیں۔ اُس حالت کا تصور کیجئے جب لکھنؤ سے نامۂ شوق پہنچا ہو۔ اور اُس کو پڑھتے ہی بدقسمت بادشاہ کے زخمِ دل ہرے ہوگئے ہوں۔ اور وُہ مجبور ہوا ہو کہ جواب میں اپنی باوفا بیگم کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھدے۔ اور پھر چشمِ عبرت وا کرکے اس خط کو۔ جو مرحوم نے ۵۔ ذیقعد ۱۲۷۳ھ کو لکھا تھا۔ اور جو غالباً زندانِ کلکتہ سے پہلا خط ہے مطالعہ فرمائیے:۔

محبت نامۂ اوّل

افسرِ فرقِ جلیل ممتاز جہاں نواب اکلیل محل صاحبہ کو سلطانِ عالم کی طرف سے معلوم ہو۔ اے تاج

فرقِ محبوباں رقعہ ہزار درقعہ تمہارا عین تشنگی انتظار میں سیراب کُن جانِ بیتاب ہوا۔ بحمد اللہ تعالیٰ یہاں تا تحریر رقیمہ محبت ضمیمہ ہر طرح کا فضل جنابِ باری ہے اور صحت اور سلامتی اُس ماہِ شبِ چہاردہ کی ہمیشہ درگاہِ خالق ارضین و سموات سے مطلوب ہے۔ شب و روز تصور رہتا ہے کہ یہ ایام ملال کس طرح بسر ہوتے ہونگے۔ کیا کہوں وہ تمہارا سکندر باغ کا رہنا اور ہمارا پروانہ وار گاڑی پر ہر دن دن بھر تمہارے ساتھ پھرنا اور ڈومنیوں کا مجرا کرنا اور راتوں کو چبوترے پر بسر کرنا اور نوبت کی صدائیں اور شہنا کی آوازیں یہ سب شبانہ روز آنکھوں کے تلے پھرتا ہے۔ دل مسوس مسوس کر رہ جاتا ہوں۔ کیا کروں زمین سخت آسمان دور ہے۔ میرا کیا قصور ہے۔ خدا غارت کرے اُن لوگوں کو جنہوں نے خانہ بربادی ہماری کی۔ ہمیں تو آج تک فلک نے ایسا پیسا ہم کہ مغز کا بھیجا ناخن سے نکلتا ہے۔ گھنے گھنے جنگل کلے کالے پہاڑ نہ کہیں سایہ نہ کہیں آڑ خدا خدا کر کلکتے میں پہنچے۔ اُس پر بھی مدعی سایہ دیوار ساں ساتھ سا ہیں۔ کاٹ پھانس سے ایک لمحہ نہیں چوکتے۔ اگر ہم گھبرا کر روز کی جھنجھٹ سے منہ بھی چُراتے ہیں۔ مگر کہنے والے پھر اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ خدا انجام بخیر کرے۔ وہ کون دن ہو کہ یادِ رُخِ مہر تمثال سینے میں نہیں بھری رہتی ہے۔

کہیو اے بادِ صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو　　　راہ ملتی ہی نہیں دشت کے آواروں کو

تری آنکھوں سے ایک لحظہ نہیں سُوجھتی۔ قاصد بہت کمیاب ہیں کہ جن کے ہاتھوں دردِ دل لکھ کر بھیجا کروں۔ اگر کوئی ڈاکیا نصیبوں سے ہاتھ آگیا تو ہزار ہزار منت اور سماجت سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر ایک آدھا خط روانہ کیا۔ خیر شکر خدا کا کہ حاکم ہو کر محکوم بننا پڑا۔ کبھی کبھی کوئی خط تم صاحبوں میں سے جو آجاتا ہے گویا جان تازہ آتی ہے۔ اور تمہارے خط کو تو سینے پر رکھا۔ چھاتی سے لگایا۔ آنکھوں پر رکھا۔ بہت چُوما چاٹا۔ یہاں تک کہ اُس کے حرف بھی مٹ گئے۔ اس پر بھی بے جواب لکھے تسکین نہ ہوئی۔ خدائے تعالیٰ ہمیں تمہیں پھر جلد باہم کرے۔ اور یہ مصیبتیں رات

دل کی کم کرے - جانِ من ہراساں نہ ہونا - نہ رونا نہ مُنھ اشکوں سے دھونا - خیر خدا نے جو مصیبت ڈالی - اُسے ہر طرح کاٹنا - ہم اتنا افسوس کرتے ہیں تو کیا پاتے ہیں - فضلِ خدا اگر ہو تو سب ایامِ غم بات کہتے کہتے کٹ جاتے ہیں - خوف ظالموں کو نہیں ہے - اتنا ستایا - اس پر بھی باز نہیں آتے - وُہی اس کا اجر دیگا - ہم تم سب سارا شہر تو مظلوم ہیں - کیا حق سُبحانہ وتعالیٰ مظلوموں کو ظالموں ہی کے پنجۂ قدرت میں رکھیگا - مظلوموں کی داد نہ دیگا - شامِ غم کب تک گھیرے رہیگی - دُنیا کب تک منھ پھیرے رہیگی - کیا صبحِ اُمید نہ ہوگی - شعاعِ عدل خورشید نہ ہوگی - دامِ بلا کب تک نہ پھٹیگا - جوبن دُنیا کب تک بن بن کے دکھلائیگی - ہمارا دل خود ایسی بیسوا دغاباز پر نہیں ہے - اس سے چمٹو تو نخرا کرتی ہے - اور اگر مُنھ پھیرو تو پانو پڑتی ہے - اس کی یہی چالیں ہیں - غضب پیٹ سے پانوں نکالے ہیں - مگر کیا ہوتا ہے - میرا اور اس کا دونو کا بنانے والا تو کوئی اور ہی ہے +

۵ - ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۲ھ

راقم جانِعالم

تازہ غزل

اسی کے ہاتھ میں بھی ہوں یہ لیجائے جہاں مجھ کو
نہ چھوڑوں آسماں کو میں نہ چھوڑے آسماں مجھ کو

اِدھر جاؤں اُدھر جاؤں کدھر جاؤں یہ حالت تھی
جب اپنے در پہ اُس نے دیکھ پایا ناگہاں مجھ کو

کیا ہے یاد ظالم نے مجھے کب والئے رے قسمت
کہ وقتِ واپسیں دو چار آئیں ہچکیاں مجھ کو

بس توبہ اگر مڈبھیڑ ہو جاتی ہے رستے میں
سلام اِک جھک کے کرتا ہے وہیں پیرِ مغاں مجھ کو

چھٹے جب ساتھ ایسے شخص کا کیونکر نہ حیرت ہو
بہت مڑ مڑ کے دیکھا کی مری عمرِ رواں مجھ کو

گئے وُہ دن کہ دریا خون کے آنکھوں سے جاری تھے
نگر دیتی ہے چھینٹے اب تو چشمِ خونفشاں مجھ کو

کہاں مجھ سا زمانے میں جفائیں جھیلنے والا
قیامت تک کرے گا یاد تو اے آسماں مجھ کو

زباں پر داغ کی کس ناز سے آیا ہے یہ مصرع
ملا ہے شاہ آصف جاہ میرا قدرداں مجھ کو

زندہ دِلی

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مُردہ خاک جیا کرتے ہیں

ایشیائی شاعری پر الزام تو لگایا جاتا ہے کہ وُہ صحیفۂ فطرت کے مطالعہ سے خالی ہے۔ لیکن ذرا اِسی شعر کو دیکھو کہ حقیقت میں شاعر نے بحرِ ناپیدا کنارِ ہستی میں غوطہ لگا کر کیا دُرِ شاہوار نکالا ہے۔ مضمون کس قدر گہرا ہے۔ مگر کتنے سیدھے سادے لفظوں میں ادا کیا گیا ہے۔ ایسی ہی بلند پروازیوں کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ حواسِ ظاہری کے تاریک پردے کو تھوڑی دیر کے لئے ہٹا کر کسی پُر نور ہستی کا جو فنیتی سے بالکل پاک ہے جلوہ دکھا دیتی ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے اشعار جو تاثیر میں ڈوبے ہُوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اگر کچھ ہے تو یہی ہے کہ وُہ صداقت سے مملو ہوتے ہیں۔ اور اس لئے اُن میں ہر شخص کو اپنے ہی واقعی جذبات کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ دِل نام تو ایک چھوٹے سے مُضغۂ گوشت کا ہے۔ مگر کیا قیامت ہے کہ ابتدا سے حضرتِ انسان اُسی کے رازونیاز سے آشنا ہونے کی فکر میں حیران و پریشان ہیں۔ لیکن رسائی کسی کی آج تک بھی نہیں ہُوئی۔ قد و قامت تو دو چار اُنگل سے زیادہ نہیں مگر وسعت کی یہ کیفیت ہے کہ تمام دنیا سما جائے۔ اور پھر بھی صدائے ھَل مِن مّزِید بلند رہے۔ عقلِ انسانی نے بہت کچھ زور لگایا۔ لیکن اس کی تہ تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ اور پہنچتا بھی کیونکر کہ خود محدود اور یہ غیر محدود۔ سچ یہ ہے کہ دل آئینۂ کائنات و خلاصۂ موجودات ہے اور اُس کی جولانگاہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کا ایک ڈانڈا قدم سے ملا ہوا ہے تو دُوسرا عدم سے۔ اگرچہ بظاہر انسان

ضعیف البنیان سے منسوب ہے۔ لیکن اس کے حدودِ اقتدار میں صرف فنا کا گذر نہیں ہوسکتا اور اسی وجہ سے غالباً یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جس چیز کا نام حکمائے اشراق نے عالم مثال رکھا ہو وُہ اسی کی سیرگاہ ہے۔ دِل ایک بحرِ ناپیدا کنار اور جذبات انسانی اس کی موجیں ہیں۔ اگر کبھی سکون ہوتا ہے تو اس بلا کا کہ قبر کی خاموشی کو مات کرتا ہے۔ اور اگر ہیجان ہوتا ہو تو اس غضب کا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ اور موجیں پہاڑوں کی طرح اُٹھتی اور بادلوں کی طرح گرجتی ہیں۔ اگرچہ دِل کی دُنیا الگ ہے۔ لیکن حادثاتِ بیرونی اس کے حق میں وُہی کام کرتے ہیں جو ہوائیں سمندر کے متعلق۔ اگر ہُوا موافق ہے تو ہنڈولے کا لُطف آتا ہو اور اگر خدانخواستہ ناموافق ہوئی تو کہیں سر چکراتا ہے کہیں غش پر غش آتا ہو اور کہیں بالکل ہی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہو۔ مگر اسی کے ساتھ دِل میں اور ایک کمال بھی ہے جو سمندر میں نہیں ہے اور وُہ یہ ہے کہ فطرت نے اس میں ایک ایسی قوت جاذبہ بھی ودیعت کی ہے کہ وُہ چاہے سکون کو تلاطم سے بدل دے۔ اور چاہے سکون کے بجائے حشر برپا کر دے ملٹن نے کیا خوب کہا ہے کہ انسان کا دِل وُہ ہلا ہے کہ چاہے جہنم کو بہشت بنا دے اور چاہے بہشت کو جہنم۔ لیکن یہ قوت انہیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو حادثات زمان سے پس پا نہ ہوکر اپنی ہمتوں کو بلند رکھتے اور شجرِ حیات کے شیریں میووں سے بہرہ ور یعنی دُوسرے الفاظ میں زندہ دِل ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے جو قومیں حوادثِ زمانہ سے مغلوب ہوکر قعرِ پستی میں جا پڑتی ہیں۔ اُن کے تمام قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کی اُمنگ باقی نہیں رہتی اور اسی کو زندہ در گور کہتے ہیں۔ پس شاعر نے جو زندگی کو زندہ دلی سے تعبیر کیا ہے یہ نہایت ہی صحیح ہے۔ کیونکہ جو زندگی حوصلہ مندی اولوالعزمی اور ترقی کی اُمنگ سے خالی ہو وُہ در اصل زندگی نہیں ہے۔ دُور کا ہیکو جائیں اگر ہم خود اپنی موجودہ حالت کا مقابلہ دُوسری قوموں اور نیز اپنی پچھلی حالت سے کرتے ہیں تو زمین و آسمان

کا فرق معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وُہ زمانہ تھا کہ ہر شخص کے دل میں عجیب طرح کی اُمنگیں موج زن تھیں اگر سوداگر ہے تو دُور دور دراز ملکوں سے نئے نئے مال کے لانے کی فکر ہے - اگر صنّاع ہے تو نئے نئے نمونے ایجاد کر کے کمال پیدا کرنے کا شوق ہے اگر ملازم ہے تو چوبداری کے سونٹے میں عصائے شاہی کی تصویر نظر آ رہی ہے - جدھر دیکھو عجب چہل پہل ہے کہیں ناچ رنگ ہے اور کہیں غزلخوانی کہیں کشتی گیری کی تعلیم ہو رہی ہے تو کہیں نیزہ بازی ہر جگہ احباب کے جلسے ہیں - اور بے تکلفانہ صحبت - غرضکہ ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات تھی یا اب یہ حال ہے کہ پریشان حالی نے نہ دُنیا کا رکھا اور نہ دین کا - حواس اس قدر منتشر ہیں کہ کہیں جمائے سے نہیں جمتے - ہاتھ پاؤں گرے سے جاتے ہیں - دل میں کسی قسم کا جوش باقی نہیں رہا - ہر طرف مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہے اور اعلیٰ جذبات کی جگہ جو اولو العزمی کے رفیقِ طریق ہیں ادنیٰ جذبات جو مایوسی کے قدم بقدم ہیں لیتے جاتے ہیں - ہمارے ہر فعل سے اخلاقِ محمدی کے بجائے ریاکاری - داد و دہش کے بجائے دنایت - محبت کے بجائے رشک وحسد تحسین و آفرین کے بجائے مذمت ٹپکتی ہے - زمانہ سابق میں جو چیزیں ہماری زندہ دلی کی دلیل تھیں وُہی اب رسوم کی زنجیریں بنکر ہمارے پائے عزیمت کو روک رہی ہیں - جلسہ ہائے احباب اب بھی ہوتے ہیں مگر نہ وُہ بے تکلفی ہے اور نہ خلوص اور نہ علمی تذکرے - دل میں رشک وحسد کی آگ جو بھڑک رہی ہے وُہ غیبت و بدگوئی کی شکل میں نمودار ہوتی ہے - بڑے بڑے کاموں کے منصوبے صبح سے شام تک باندھتے رہتے ہیں - مگر ارادے اور فعل کا فاصلہ اس قدر بڑھ گیا ہو کہ ہمارے طے کیے سے طے نہیں ہو سکتا - سوداگر ہیں تو پست ہمت - صنّاع ہیں تو کاہل - اور ملازم ہیں تو حوصلہ مندی سے اس قدر دُور کہ اہلکاری ہی معراج سمجھتے ہیں - ہماری بزم خوشی میں مجلسِ ختم کا سماں نظر آتا ہے - کام تو اب بھی کرتے ہیں - مگر کس بیدلی سے - داغ نے سچ کہا ہے - ع

پریشانی میں کوئی کام جی سے ہو نہیں سکتا

غرضکہ ہمارے قوائے جسمانی کی طرح قوائے دماغی پر بھی ایک مُردنی سی چھا گئی ہے۔ اور گو رفتارِ زمانہ سے مجبور ہو کر اہلِ مغرب کی تقلید پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ مگر پستی اور اضمحلال کسی کام کو انتہا تک پہنچانے نہیں دیتا۔ بُنیاد سب کاموں کی ڈالتے ہیں مگر پورا کوئی نہیں ہوتا۔ ہر جگہ انجمنیں اور کلب قائم ہوتے ہیں مگر اُن کی تعمیر ہی میں ایک خرابی کی صُورت مضمر رہتی ہے کہ کبھی اپنی غرض میں کامیاب نہیں ہوتے۔ غرضکہ مُردہ دلی نے ہماری زندگی کو موت کا نمونہ بنا دیا ہے۔ اور سچ یہ کہ جب زندہ دلی ہی نہ رہی تو زندگی سے کیا فائدہ۔ اب ذرا، زندہ قوموں کو دیکھو کہ اُن کے ہر قول ہر فعل یہاں تک کہ کھیل کود میں بھی زندہ دلی جلوہ دکھا رہی ہے۔ جس کام کو ہاتھ میں لیتے ہیں اس کو انتہا پر پہنچا کر چھوڑتے ہیں۔ دلی جوش اور استقلال عزم چھوٹی سی چھوٹی بات میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ دُنیا کی نسبت سمجھتے ہیں کہ کچھ کرنے اور کر دکھانے کی جگہ ہے۔ اُمنگیں ہیں کہ سمندر کی موجوں کی طرح دل میں اُٹھ رہی ہیں۔ اور لغو سے لغو کام کو بھی ایسی یکدلی سے کرتے ہیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ صنعت کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ اور اس ذریعہ سے دُنیا کی تمام ضرورتوں پر حاوی ہو گئے ہیں۔ تجارت کو دیکھو سطحِ ارض کا چھوٹے سے چھوٹا کونا بھی ایسا باقی نہیں ہے جہاں ان کی ہنرمندی کی آثار موجود نہ ہوں۔ دامنِ حکومت ہے کہ بلا کوشش بڑھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ہر شخص کے ارادے اس قدر اُونچے ہیں کہ اپنے آپ کو خلیفۃُ اللہِ فِی الْاَرضِ سمجھتا ہے اور یہ ذہن میں جما ہوا ہے کہ نظامِ عالم کی اصلاح اُس کا اور اس کی قوم کا حصہ ہے۔ اب اگر معاشرت کو دیکھو تو عجب تماشا نظر آتا ہے۔ دن بھر تو ہر شخص اپنے کام کی دُھن میں رہتا ہے۔ مگر شام سے تمام شہر ایک عظیم الشان تماشا گاہ بن جاتا ہے۔ جدھر نظر اُٹھا کر دیکھو کلب اور تماشا گاہیں روشنی سے ایسی جگمگا رہی ہیں کہ نظر کام نہیں کرتی۔ کہیں نغمہ و سرود ہے۔ کہیں سرکس کے ذریعے سے فنونِ سپاہ گری کی ترقی ہے۔ کہیں بازی گری کے طلسم ہیں۔ کہیں علمی تذکرے ہیں۔ اور

کہیں احباب کے جلسے اور مختلف قسم کے دلچسپ مشغلے ۔ غرضکہ دن میں جس طرح ہر شخص کی زندگی کا مقصد دولت کمانا تھا ۔ اسی طرح رات کے وقت عیش اڑانا ہے ۔ حقیقت میں اُنہیں کی زندگی زندگی ہے ۔ اور انہیں کا عیش عیش ہے ۔ اہل یورپ کو تو جانے دو جاپانیوں ہی کو دیکھو جو باعتبار مرز و بوم و مذہب ہم سے قریب ہیں ۔ ہماری مُردہ دلی دیکھو کہ تقریباً ڈیڑھ صدی سے مغربی تہذیب سے ٹکر کھا رہے ہیں ۔ مگر سوائے ظاہری رنگ و روغن کے کسی قسم کی حقیقی ترقی نہیں ہُوئی ۔ یا جاپانیوں کی زندہ دلی دیکھو کہ چالیس سال کے قلیل زمانے میں وُہ ہر اعتبار سے اہلِ یورپ کے مدمقابل بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر اور اقوامِ ایشیا کے سرتاج بن گئے ہیں ۔ اُن کے مُدبّروں کو دیکھو کہ پرنس بسمارک کو مات کرتے ہیں ۔ اُن کے جنرلوں کو دیکھو کہ ان کے کارنامے نپولین کی یاد تازہ کرتے ہیں ۔ اُن کے امیر البحروں کی کارگذاریاں خیر الدین پاشا اور لارڈ نیلسن کے کارناموں کو فراموشی کے حوالے کر رہے ہیں ۔ تعلیم و تعلّم کی یہ کیفیت ہو کہ جہالت سے بدتر کوئی عیب نہیں ہو ۔ یہاں تک کہ ۹۰ فیصدی لکھ پڑھ سکتے ہیں ۔ ان کے صنّاعوں کی ہمتیں یہانتک بڑھی ہُوئی ہیں کہ اپنے مُلک کو چھوڑ کر تمام دُنیا کی ضرورتوں پر حاوی ہونا چاہتے ہیں ۔ پردۂ عالم پر کوئی بندرگاہ ایسی نہیں ہے ۔ جہاں اُن کے جہاز والوں کا گذر نہ ہو ۔ ذاتی نیکنامی کا کسی کو خیال نہیں ۔ مگر قومی عزت پر ہر شخص جان دیتا ہے ۔ یہ زندہ دلی ہی کا جلوہ ہے کہ گل و اودی کا ہر شخص دلدادہ ہے اور پھُول کھلنے کے موسم میں کوئی کمبخت ایسا نہ ہوگا کہ ان کے حُسن دل افروز سے نظارہ کو سیراب اور بُوئے خوش سے دماغ کو معطر نہ کرتا ہو ۔ جھڑبیری کو دیکھ کر ہم کو تو بچپن کے مزے یا غریب بنئے کی "کہو تو کہدوں" والی نقل یاد آتی ہے ۔ مگر جاپان میں لوگ اُس کے ننھے ننھے نازک پھُولوں کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ موسم بہار میں جنگلوں میں پھُولوں سے زیادہ انسانوں کی کثرت ہوتی ہو ۔ جو بادۂ عشرت

کے بجائے اُس کی مست بُو سے فیضیاب ہوتے ہیں نوروز کو ہر شخص اپنا گھر کاغذی لالٹینوں مختلف الالوان جھنڈیوں اور بوقلموں پتّوں سے ایسی خوبصورتی سے سجاتا ہے کہ شہر اور قصبے دلہن معلوم ہونے لگتے ہیں - یہ زندہ دلی کا ہی کرشمہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے جاپانیوں نے اُن تمام علوم وفنون میں جن پر زمانۂ موجُودہ کی ترقی کا دارومدار ہے وُہ کمال حاصل کرلیا جو یورپ کو صدیوں کی کشش وکوشش میں نصیب ہوا تھا اور موجُودہ جنگ میں ثابت کر دیا ہے کہ خواہ بالآخر اُنکو شکست ہو یا فتح مگر کوئی قوم فنونِ جنگ شجاعت و دلاوری حب وطن ایثارِ نفس اور قومی خیر خواہی میں اُن پر سبقت نہیں لیجا سکتی - اگرچہ مغربی خیالات کی اشاعت کی بدولت مدّت سے اس امر کے آثار پائے جا رہے ہیں کہ ہمارا ملک بھی صدیوں کی نیند سے بیدار ہو کر کروٹ بدلنے کو ہے - مگر مایوسی اُٹھنے نہیں دیتی - لیکن اب خوش قسمتی سے دمِ عیسیٰ بھی مدد کے لئے موجُود ہو گیا ہے اور جاپان کی ترقی ایسی آواز ہے جس کا نہ سُننا ممکن نہیں ہے - ہمارے بیحس شانوں کو ہلا ہلا کر قُم باذنی کہ رہی ہے - پس اے ہموطنو ! اُٹھو اور ایک زندہ قوم بنکر دُنیا کی نعمتوں میں اپنا حصّہ لو !! کیونکہ بقولِ بیدل ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیرِ سرو وسمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ در دلِ کشا بچمن درآ

محمد عزیز مرزا

کلامِ داغ

(۱)

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ہائے یہ کونسے بلبل کے چہچہے کی آواز کان میں آئی۔ افسوس اب اُس کے میٹھے میٹھے دل نشین چہچہے سُننے کو چمنستانِ سخن کے گلچین ترسا کرینگے۔ وہ سریلی صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئیں اور اُس عندلیبِ خوش الحان نے اس گلستانِ فنا میں اپنا آشیانہ چھوڑ کر بُستانِ بقا میں جا بسیرا کیا۔

گذشتہ چند سالوں میں کئی دفعہ حاسدوں نے مرحوم کے انتقال کی خبریں اُڑائیں مگر وہ خبریں غلط نکلیں لیکن ہائے! آخر کار مرحوم و مغفور کا یہ شعر صادق آیا پر آیا۔ ؎

آج راہی جہاں سے داغؔ ہوا　　خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

آج کے مضمون میں ہم مرحوم کی شاعری پر ایک نقادانہ نظر ڈالتے ہیں۔ داغ نہیں ہیں تو اُنکا کچھ ذکر مذکور ہی سہی کیونکہ خواجہ حالی سلمہٗ اور خود مرحوم کے قول کی رو سے (موجودہ حالات میں بہرحال) ؎

نعم البدل ہے داغ کا حالی کلامِ داغ　　ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

اس میں شک نہیں کہ مرحوم کی وفات سے رنگیلی عاشقانہ شاعری کے ایک مقبول اور متعارف اندازِ کلام کے اُستادانہ رنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس رنگ کو اور لوگوں نے بھی اختیار کیا ہے مگر داغ

کے کلام میں اس رنگ کے ساتھ اُستادی کا پہلو شامل تھا اور دوں میں فی زمانا یہ بات کہاں؟ دیکھنا یہ ہے کہ وُہ رنگ کیا ہے اور کیسا ہے۔

ابتدا میں اس قدر صاف صاف کہہ دینا ضروری ہے کہ مرزا داغ کی اُستادی میں سخن پرور اور دیدہ دانستہ مخالفت کرنے والوں کے سوا کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ جس سخنور کے تین ضخیم دیوان اور ایک پھڑکتی ہوئی لاجواب مثنوی شایع ہو کر قبولِ خاص و عام کا تمغا حاصل کر چکی ہو جس کی فصاحت جس کی زبان جس کے بیان جس کی شوخی جس کی روانیِ طبع جس کی جدت مضامین کے سکے دلوں پر بیٹھ چکے ہوں جس کا کلام زبانوں پر رواں ہو کر خواص سے عوام تک کے دلوں میں چٹکیاں لے چکا ہو جس کے دم سے فیضِ سخن پھیل کر شاگردوں کی تعداد ہزار سے اُوپر پہنچ چکی ہو جس کے مستفیضانِ فن کے زمرے میں متعدد مستعد اور برگزیدہ شاعر شامل ہوں اُس کی اُستادی میں کیا شک ہے؟ رہی زبان۔ سو ہم اُس کا معاملہ بھی چند لفظوں میں طے کئے دیتے ہیں۔ مرزا داغ دہلی مرحوم کے قدیم ترین اور شریف ترین خاندانوں میں سے ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہیں پلے وہیں تعلیم و تربیت پائی جوانی تک اُن لوگوں میں رات دن رہے جن کی زبان کا ایک ایک لفظ ٹکسالی تھا گویا جن کے گھر میں اُردو نے جنم لیا۔ ذوق و غالب اور اُن کے ذی کمال معاصرین کی صحبتوں سے فیض اُٹھایا۔ ان سب اثروں پر خود مرزا داغ کی سخن خیز طبیعت اور سلیم مذاق کو مستزاد کیجئے تو ہر سمجھنے والے کے لئے نتیجہ یہی ہے کہ زبان کے معاملے میں جو کچھ ایسا شخص کہے وُہ سند ہے اور پھر رامپور کے ایام کی صحبتیں بھی نظر انداز نہ کرنی چاہئیں بڑے بڑے اہلِ کمال وہاں اس زمانے میں موجود تھے۔ اُن کے ساتھ ایامِ قیام رامپور میں مقابلے رہتے تھے۔ ایسے مقابلے قدرتی سلامت مذاق اور جودتِ طبع پر وہی کام کرتے ہیں جو سونے پر سہاگا۔

سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا

جس شخص کا مولد و منشا ایسا ہو جس کی تعلیم و تربیت ایسی ہو جس کی طبیعت اور جس کا مذاق ایسا ہو جو ایسی صحبتوں کے امتحان پاس کر چکے اور جو اتنا کچھ لکھ چکے وُہ جو کچھ کہیگا اُس کو ماننا ہوگا اگر کہیں تصرف بھی کریگا تو اس کا حق ہے اور ہم کو سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔ زبان کا قصہ تو یہیں ختم کیا جاتا ہے اور یہ بھی محض دفع دخل مقدر ہے کیونکہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ وقتاً فوقتاً مرزا داغ پر کسی نہ کسی بہانے سے اعتراض کرنا اپنے لئے باعثِ شہرت سمجھتے رہے ہیں ایسے لوگ اب بھی ہیں اور پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ خیر اُن کے طریقے اُنہیں کو مبارک

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

ہم اپنی اصلی بحث کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

جب مرزا داغ کے رنگ کی خصوصیات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو سب سے پہلے اُن کی زبان کی سادگی اور بے تکلفی اور محاورے کا التزام نگاہِ توجہ کو کھینچتا ہے۔ کوئی سی غزل لے لیجئے اور تقریباً کوئی سا شعر پڑھئے کوئی نہ کوئی چبھتا ہوا لفظ کوئی نہ کوئی چست محاورہ پایئگا جو زبان اور بیان کی جان ہے مثلاً

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

کیا تصویر کھینچی ہے اور کیسی چست اور چٹخارے دار زبان ہیں۔ اور ملاحظہ ہو

دلوں پر سیکڑوں سکے ترے جوبن کے بیٹھے ہیں کلیجوں پر ہزاروں تیر اس چتون کے بیٹھے ہیں

بیٹھنا دو طرح باندھا ہے۔ اور لیجئے۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

نکر عشق و جنوں میں گفتگو اے ناصح ناداں ترا منہ ہے کہ تو بولے یہ سرکاروں کی باتیں ہیں

بتوں کی ایک چپ اے داغ لاکھوں کو ہراتی ہے جسے کہتے ہیں خاموشی یہ عیاروں کی باتیں ہیں

اسی طرح جس شعر کو دیکھئے گا زبان کے پہلو سے لاجواب پائے گا۔

اس خصوص میں اُنکو اپنے اُستاد شیخ ابراہیم ذوق سے بہت مشابہت ہی اگرچہ ایک بڑا فرق بھی ہے اور وہ زمانے کی ترقی کا تقاضا ہی - وُہ یہ کہ شیخ ابراہیم ذوق بسا اوقات اِس لئے شعر کہتے ہیں کہ کسی محاورے کا باندھنا مقصود ہوتا ورنہ اور کوئی مطلب اُس شعر کے کہنے سے معلوم نہیں ہوتا - مثلاً -

آج یہاں کل وہاں گذرے یونہیں جُگ ہیں کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اس سے ہری جُگ ہیں

ہری جُگ کا محاورہ باندھنا مقصود تھا اِسی لئے جُگ کا قافیہ لائے اور اسی لئے سبزہ رنگ کی رعایت پیدا کی اور شعر کہا - داغ میں یہ بات نہیں - یہاں شعر پہلے ہے اور محاورہ اُس کے ساتھ لازم و ملزوم کا مصداق ہے -

بڑی خُوبی یہ ہے کہ زبان کے چٹخارے کے ساتھ بندشیں چُست ہیں اور یہ امر بہت مشکل ہے - کیونکہ خالص ریختہ لکھنے میں عموماً بندش ایسی چُست نہیں رہسکتی جیسی اضافتوں اور عطفوں کی امداد سے رہ سکتی ہے - حتّٰی کہ بعض لوگ جو اپنی چُستی بندش پر بہت کچھ اتراتے ہیں اُن کا بڑا اسہارا یہی ہے کہ اضافتوں کا تانتا باندھ دیتے ہیں یا عطف پر عطف (فارسی قاعدے سے) لکھے چلے جاتے ہیں اور ایک آدھ ہندی الاصل لفظ درمیان لاکر اُردو لکھنے کا نام کر دیتے ہیں - مثالیں لکھی جاسکتی ہیں مگر اس سے خواہ مخواہ کسی کے کلام پر تعریض لازم آجائیگی اِس لئے اسی قدر لکھنا کافی ہی -

مرزا داغ کی پُرگوئی قابلِ توجہ ہے - جس زمین کو لیتے ہیں اُس میں شاذ ہی کوئی قافیہ چھوڑتے ہیں اور بعض زمینوں میں دوغزلہ سہ غزلہ بھی لکھ جاتے ہیں ایک ہی قافیے کے مختلف پہلو نبھاتے ہیں - ردیف کو کئی کئی طرح سے لاتے ہیں - غرض اُستادوں کی روش کو خوب نبھایا ہے - اِس پُرگوئی میں غالباً امیر مرحوم ان سے بڑھے ہُوئے ہیں مگر یہ بھی اپنی جگہ کسی سے دبنے والے نہیں - یہ پُرگوئی اُن کی قادر الکلامی کا بڑا ثبوت ہی - مشکل اور سنگلاخ زمینیں کثرت سے آزمائی ہیں اور خوب خوب زورِ طبیعت دکھایا ہے -

مرزا داغ کی طبیعت کی روانی میں کلام نہیں۔ آمد کثرت سے ہو اور آورد کا بظاہر کہیں نام تک نہیں۔ مہتاب داغ کی غزلیں دیکھنے سے خصوصًا ثابت ہوتا ہے کہ انکو غزل لکھتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ گلزارِ داغ میں احتیاط اور غور روانیٔ طبع کی باگ تھامے ہُوئے ہی۔ آفتاب داغ میں گلزار کا سا پھُونک پھُونک کر قدم رکھنا نہیں پایا جاتا اور مہتاب داغ میں تو توسنِ طبع کہیں رُکتا ہی نہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ تلاشِ مضمون بلند یا نازک نہیں ہے وُہی روزمرہ کے عاشقانہ چٹکلے ہیں جو ایک لاجواب لُطف کے ساتھ ادا کیۓ گۓ ہیں کلام ہر جگہ عام فہم ہے مگر خواص کے لئے بھی جابجا وُہ تیر و نشتر موجود ہیں جو دِل میں بیساختہ کُھب جاتے ہیں اور تڑپا ہی تو دیتے ہیں۔ اس مضمون کے آخری حصّے میں جو چند انتخابی اشعار درج کیۓ جائینگے اُن سے یہ بات ثابت ہو گی۔

شوخی اور چلبلاہٹ اُن کا حصّہ ہے۔ عاشق و معشوق کی چھیڑ چھاڑ اور نوک جوک کے مضامین ان سے بڑھ کر کوئی کیا لکھیگا۔ اس خصوص میں ان کا کلام اس زمانے کی عملی عاشقی کی عکسی تصویر ہے گویا عاشقی اور معشوقی کو فن کے درجے تک پہنچا دیا ہے یہ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جاۓ کہ ان کا کلام معشوقوں کو علمِ ناز آفرینی کے نکات اور فنِ عشوہ گری کے رمُوز سکھاتا ہے اور عاشقوں کو حسینوں کے اندازوں اور اداؤں کی زنگارنگی دکھاتا ہے اس رنگ کا اخلاقی اثر چنداں اچھا نہیں اس پر ذیل میں الگ بحث کی جایگی مگر اس اندازِ کلام کی دلفریبی اور دلآویزی میں شک نہیں۔

مثلًا اس سے زیادہ شوخی کیا ہو گی۔

اِس لئے وصل سے انکار ہے ہم جان گۓ
یہ نہ سمجھے کوئی کیا جلد کہا مان گۓ

وقت ملنے کا جو پُوچھا تو کہا کہدیں گے
غیر کا حال جو پُوچھا تو کہا ہے کہتے ہیں

سنگِ دِل کہنے سے تو آپ بُرا مان گۓ
یہ جو کچھ سینے پہ ہے اسکو بھی پتھر نہ کہوں

واعظ یہی نہ کہدے کہ پیدا ہی کیوں ہُوئے
دُنیا میں آئیں اور رہیں پاکباز ہم

کوئی خُوبی نظر آتی نہیں تجھ میں ظالم
اَے فلک پیری و صد عیب بجا کہتے ہیں

کوئی بزم وعظ سے کہتا گیا
ایسے جلسے بے شراب اچھے نہیں

پند واعظ سُنتے سنتے کان اپنے بھر گئے
کیا عبادت کو ہمیں ہیں سب فرشتے مر گئے

معشوق کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے اشعار زیادہ درج نہیں کئے جاتے مگر داغ کے دیوان اُن سے بھرے پڑے ہیں۔ اہلِ تقوٰی سے نوک جھونک کرتے کرتے ایک شعر میں شوخی حد سے گذر گئی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی کیا کہے گا۔

آدمی ایسا کہاں کوئی فرشتہ ہو تو ہو
شیخ صاحب یہ نہیں معلوم تم کس پر گئے

شوخی کی ترنگ میں بعض دفعہ کوئی رکیک عامیانہ بازاری مضمون بھی لکھ جاتے ہیں مثلاً وہ مشہور شعر جس کا دُوسرا مصرع یہ ہے۔

مٹّی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

تصوّف کا رنگ ان کے ہاں کم ہے مگر ایسے شعر ہیں ضرور جو متصوفانہ پہلو رکھتے ہیں یا تدبّر و تفکر کی طرف مائل ہیں۔ مثلاً یہ غزل کی غزل اسی رنگ میں ڈوبی ہُوئی ہے۔

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے
دِل سے سب کچھ بھُلا دیا تو نے

ہم نکمّے ہُوئے زمانے کے
کام ایسا سکھا دیا تو نے

کچھ تعلّق رہا نہ دُنیا سے
شغل ایسا بتا دیا تو نے

کس خوشی کی خبر سنا کے مجھے
غم کا پُتلا بنا دیا تو نے

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے
دِلِ بے مدعا دیا تو نے

کیا بتاؤں کہ کیا لیا مَیں نے
کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے

بے طلب جو مِلا مِلا مجھ کو
بے غرض جو دیا دیا تو نے

عمرِ جاوید خضر کو بخشی — آبِ حیواں پلا دیا تُو نے
نارِ نمرود کو کیا گلزار — دوست کو یُوں بچا دیا تُو نے
دستِ مُوسیٰ میں فیضِ بخشش سے — نُور و لوح و عصا دیا تُو نے
صبحِ موجِ نسیمِ گلشن کو — نفسِ جانفزا دیا تُو نے
شبِ تیرہ میں شمعِ روشن کو — نُورِ خورشید کا دیا تُو نے
نغمہ بلبل کو رنگ و بُو گل کو — دلکش و خوشنما دیا تُو نے
کہیں مشتاق سے حجاب ہُوا — کہیں پردہ اُٹھا دیا تُو نے
تھا مرا مُنہہ نہ قابلِ لبّیک — کعبہ مجھ کو دکھا دیا تُو نے
جس قدر مَیں نے تجھ سے خواہش کی — اُس سے مُجھ کو سوا دیا تُو نے
رہبرِ خضر و ہادیٔ الیاس — مجھ کو وُہ رہنما دیا تُو نے
مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب — نقش اپنا جما دیا تُو نے
ہے یہی راہِ منزلِ مقصُود — خُوب رستے لگا دیا تُو نے
مجھ گنہگار کو جو بخش دیا — تو جہنم کو کیا دیا تُو نے
داغ کو کون دینے والا تھا — جو دیا اے خدا دیا تُو نے

یہ غزل اور وُہ غزل جس کے تین شعر اب درج کیے جاتے ہیں بظاہر حج سے واپس آکر لکھی گئی ہیں۔ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے پاک اثر سے حُسنِ عقیدت جوش پر ہے۔

عدم سے دیکھنے رنگِ ظہُور ہم آئے — ملا نہ جس کے لئے اتنی دُور ہم آئے
مدینہ چھوڑ کے پھر رامپور ہم آئے — یہ کس بلا میں دلِ ناصبُور ہم آئے
ہزار شکر ہمیں داغ حج نصیب ہُوا — قصُور وار گئے بے قصُور ہم آئے

غنچۂ گل میں دھرا کیا ہے، بتا اے بلبل — جمع ہیں چند ورق وُہ بھی بکھرنے والے

کہ ان دونوں اُستادوں کا اکثر حصہ غزلیات ہم طرح ہے۔ مگر اوّل تو ایسے مقابلے کے لئے بجائے خود ایک مستقل اور مبسوط مضمون چاہئے۔ دُوسرے ہم ایسے مقابلوں کے چنداں قائل بھی نہیں۔

گل جو چمن میں ہیں ہزار دیکھ ظفر ہے کیا بہار | سب کا رنگ الگ الگ سب کی ہی بو الگ الگ

دونوں اُستادوں کا رنگ حقیقت میں الگ الگ ہے مگر دونو اپنی اپنی جگہ لاجواب ہیں۔ مقابلہ کرنے والے مقابلے کیا کریں مگر داغ کی قدر امیر جانتے تھے اور امیر کی قدر داغ جانتے تھے۔ کہیں کہیں اپنے اپنے اشعار میں اس کا اشارہ کر جاتے ہیں اور ایک دُوسرے کے کلام کی داد دے جاتے ہیں۔ امیر فرماتے ہیں:-

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے "بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں"

اُدھر داغ لکھتے ہیں:-

اے داغ ہی دکن سے بہت دُور لکھنؤ | ملتے امیر احمد و سید جلال سے

یہ کہا جاتا ہے کہ داغ کا حصہ شوخی ہے اور امیر کا مابہ الامتیاز متانت اور نزاکتِ مضامین۔ یہ قریباً درست ہی۔ مگر حق یہ ہے کہ امیر جب شوخی پر آتے ہیں تو قیامت ڈھاتے ہیں اور داغ سے کسی صورت سے کم نہیں رہتے۔ برعکس اس کے امیر کے ہاں تصوف اور حکمت کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں جو داغ کے ہاں بہت کم ہیں۔ گویا امیر داغ کے رنگ میں لکھ جاتے ہیں مگر داغ امیر کے رنگ میں نہیں لکھ سکتے یا انکی توجہ امیر کے خاص رنگ کی طرف ہوئی ہی نہیں۔

اب ہم مرزا داغ کے کلام سے چند اشعار انتخاب کر کے درج کرتے ہیں اور ان ہی پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

جنبشِ لب کہہ دیتی ہے وُہ اب ہنستے ہیں | موجزن چشمۂ حیواں ہی اُبلنے کے لئے

سُبحان اللہ کیا پیاری تصویر ہی اور آغازِ تبسم کی کیا لاجواب تشبیہہ ہی۔ تخلص کا نباہ مُلاحظہ ہو

فرماتے ہیں :-

باغِ عالم میں ہیں سب پھولنے پھلنے کے لئے
ورنہ کیا داغ تری طرح سے جلنے کے لئے؟

ملے مجھ سے تو فرمایا تمہیں کو داغ کہتے ہیں
تمہیں ہو ماہِ کامل میں تمہیں رہتے ہولا ہیں؟

اور دیکھئے کیا بے ساختہ فرما گئے ہیں۔ زبان کی بے تکلفی قابلِ توجہ ہے۔

اُنہیں فرصت بھی ملے گھر سے نکلنے کے لئے
دوپہر چاہئے پوشاک بدلنے کے لئے

عالمِ یاس کی فارغ البالی کی نسبت فرماتے ہیں :-

قربان جاؤں یاس کے یہ کیا ملی دُنیا ملی
اک دولتِ جاوید ہے ایک سلطنت ہے دل کے پاس

اسی غزل میں لکھتے ہیں۔ اور کیا خوب لکھتے ہیں۔

رہبر نے راہِ عشق میں برسوں دیئے چکر مجھے
ظالم سے جب پوچھا کہا اب آگئے منزل کے پاس

دیکھے ہیں حُسن و عشق کے ہم نے نرالے شعبدے
موسیٰ کی جو مٹھی میں تھا وہ داغ نکلا دل کے پاس

ذرا حُسنِ تشبیہہ ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں :-

سوز و گدازِ عشق کا لذت چشیدہ ہوں
مانندِ آبلہ ہمہ تن آبدیدہ ہوں

اُفتادگی یہ بھی نہ گئی میری جستجو
گویا زمیں پہ سایۂ مرغِ پریدہ ہوں

عالمِ یاس میں آرزو کا دل میں گدگدی کرنا اور دلِ حرمان چشیدہ کا اس سے گھبرانا ملاحظہ ہو۔ لکھا ہے :-

اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ
میں پائے شوق و دستِ تمنا بریدہ ہوں

ایذا طلبی اور ایذا دوستی دیکھئے۔ فرمایا ہے :-

ذکر نا منفعل اے ناخنِ غم تیغِ قاتل سے
کہ رنگِ گریہ کہتا ہے جگر کے زخم بھرتے ہیں

حُسن کی عالمگیر تماشں اور نگاہِ نظارہ جُو کی جستجو ملاحظہ فرمایئے۔ کہتے ہیں :-

میں تو ہر اندازِ معشوقانہ کا دیوانہ ہوں
گل پہ بلبل ہوں اگر تو شمع پر پروانہ ہوں

یہ شوقِ خود نمائی کیا کچھ جنوں سے کم ہے — بیتاب تجھ کو لایا خلوت سے انجمن میں

ترا اک وعدۂ دیدار اور وُہ بھی قیامت پر — پھر اُس پہ صبر آتا ہائے دلِ اُمیدواروں کا

جلوۂ ہوش رُبا دیکھ لیا اَے مُوسٰی — یاں تحیر میں وہ لذت ہے جو عرفاں میں نہیں

ان کے دیوانوں میں اُس رنگ کا کلام کثرت سے مل سکتا ہے جسکو سہلِ ممتنع کہا جاتا ہے زبان سیدھی سادی۔ بندش بے ساختہ مگر لاجواب۔ مضمون بانکا۔ ظاہر میں نہ کوئی صنعت ہے نہ کوئی تصنع۔ مگر شعر ہے کہ جواب نہیں رکھتا۔ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

ہمیں خدا نے بہت رنج وغم دیا اے داغ — بُتوں کے دل میں نہ تھوڑا سا رحم ڈال دیا!

حضرتِ دل آپ ہیں جس دھیان میں — مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

دل کی قیمت اک نگہ ہے اَے صنم — آ گئے جو آئے ترے ایمان میں

مجھ سے کہتا ہے یہ احسان جتا کر ظالم — ہم سوا تیرے کسی پر بھی ستم کرتے ہیں؟

کیسا نظارہ کس کا اشارہ کہاں کی بات — سب کچھ ہے اور کچھ نہیں نیچی نگاہ میں

آئینہ دیکھتے ہی بیٹھ گئے تھام کے دل — پھر کہا آہ مجھے کیوں یہ ادائیں آئیں

گو محبت سے مری خاک نہ آیا مجھ کو — اس پہ مرتا ہوں کہ تم کو تو ادائیں آئیں

دل داد خواہ ظلم جو آئے کینہ جو نہ ہو — کل عرصہ گاہ حشر میں پھر تو ہی تو نہ ہو؟

لے تو چلا ہے ناصح ناداں پیامِ وصل — میں شرط باندھتا ہوں جو بے آبرو نہ ہو

کافر خدا کرے کہ غلط ہو مرا گماں — جو میں سمجھ رہا ہوں وہ اے کاش تو نہ ہو

بھر دیں عجب ادائیں اُس شوخ سیمتن میں — اک ٹیڑھ سادگی میں اک سیدھ بانکپن میں

تم شہرتِ جمال سے کس جا کہاں نہیں — میں اضطرابِ دل سے جہاں ہوں وہاں نہیں

تم کو چاہا تو خطا کیا ہے بتا دو مجھ کو — دُوسرا کوئی تو اپنا سا دکھا دو مجھ کو

تم سے بچ کر اک وفا حصے میں اپنے آ گئی — تم نے خوبی کونسی چھوڑی زمانے کے لیے

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد / ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

یہ داد ملی اُن سے مجھے کاوشِ دل کی / جس کام کی عادت ہو وہ مشکل نہیں ہوتا

ان کے کلام میں ایک خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے محشر کے مضامین بکثرت لکھے ہیں جیسا کہ رِند نے بلبل کے مضامین کثرت سے لکھے ہیں - اس کثرت اور رنگارنگی کے ساتھ محشر کے مضامین کسی اُستاد کے کلام میں نہیں - چند مثالیں درج کی جاتی ہیں -

نامۂ اعمال مجھ سے چھین کر محشر میں وہ / کہتے ہیں اپنے لئے افسانہ ایسا چاہیئے

چال اُن کی دیکھنا گویا بڑے مظلوم ہیں / سب سے پہلے عرصۂ محشر میں حاضر ہو گئے

ہائے دُنیا تو کہاں وہ عیب پوشی اب کہاں / عرصۂ محشر میں رسوائی سی رسوائی ہوئی

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو / اور پھر ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

دیکھنا سیرِ سرِ حشر مرے پاس آکر / کہتے ہیں کون ہوں میں جانتے ہو تم مجھ کو

ہے عجب اندھیر کوئی داغ کا پُرساں نہیں / صبحِ محشر بھی الٰہی شامِ تنہائی ہوئی

تم کو تو حشر کے دن لاکھ میں پہچان لیا / میں بھلا کون ہوں میرا تو پتا دو مجھ کو

ان کے کلام کا اخلاقی پہلو قابلِ اعتراض ہے اوّل تو ہماری شاعری میں بہت کم اُستادوں کا کلام ایسا ہے جو اس پہلو سے اعتراض سے خالی ہو مگر داغ کے کلام میں یہ بات خاص طور پر نمایاں ہے کہ معشوق لازمی طور سے بازاری ہے جس کے کئی کئی کامیاب چاہنے والے ہیں - ہر ایک چاہنے والا ہر ایک دوسرے چاہنے والے کا رقیب ہے - اور معشوق ہے کہ کبھی ایک کی بغل گرم کر رہا ہے کبھی دوسرے کی - مثلاً یہ بازاری معشوق نہیں تو اور کون ہے؟

مٹی کی مورت اس کو تو اے داغ خوب ہے / معشوق کیا جو شوخ نہ ہو خوش گلو نہ ہو

سریلی صدائیں ہیں اُس شوخ کی سی / الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے

پھڑک جائے کیونکر نہ انسان سُنکر / رسیلی سریلی صدائیں تمہاری

ایسے معشوق کے عشق میں شاعر لوگ وُہ حیثیت اختیار کرتے ہیں جس میں وُہ معشوق کی نظرِ عنایت اکثر دوسروں ہی پر پاتے ہیں اور خود ہمیشہ مظلوم اور داد خواہ رہتے ہیں۔ اس قسم کا عشق وفاشعاری اور صبر و تحمل کے دعووں سے پُر ہے مگر صاف صاف عیاشانہ رنگ کا عشق ہے کہ آج کسی معشوق پر نظر ہے اور کل کسی پر۔

تو جو ہرجائی ہے اپنا بھی یہی طور سہی — تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

اگر سوسائٹی کے موجودہ حالات کو نظر انداز نہ کریں (اور تنقید کرتے وقت ان حالات کو نظر انداز کرنا تقاضائے انصاف کے خلاف ہے) تو صرف اسی قسم کا عشق ممکن نظر آتا ہے خالص اور پاکیزہ عشق کے لئے بہت کم موقعے ہیں۔ مگر اس سے عاشقانہ شاعری کے اس رنگ کا صرف سبب دریافت ہو سکتا ہے۔ جواز کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔

اُوپر کی بحث سے عیاں ہو کہ مروجہ انداز تغزل میں مرزا داغ کا پایہ نہایت اعلیٰ ہی مگر مرزا صاحب نے قصیدے بھی لکھے ہیں۔ مہتاب داغ میں کئی قصیدے درج ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کسی میدان میں بند نہیں۔ اگر ان کے قصائد سے نمونے درج کئے جائیں تو مضمون کے طویل ہو جانے کا اندیشہ ہو مگر اس میں شک نہیں کہ ان قصائد میں قصیدے کی ضروریات موجود ہیں۔ مضامین کی رفعت بیان کی فصاحت الفاظ کی شوکت غرض سبھی کچھ ہے۔ اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ صرف ایام قیام حیدرآباد ہی میں قصیدے کی طرف توجہ کی ہے اور وُہ بھی غالباً خاص تقریبات شاہی کے لئے مگر طبیعت کی استعداد اور قلم کا زور اس قدر ہے کہ اس نئے میدان میں بھی بڑے بڑے کارنامے نمایاں کر دکھائے ہیں۔ تشبیب مزے کی۔ ہاتھی گھوڑے تلوار کی تعریف شاندار۔ مضامینِ مدحِ ممدوح پر شوکت اور کیدار۔ بیان متین اور زبان دلنشین۔ غرض کسی بات کی کمی نہیں دیکھی جاتی۔ ایک قصیدہ نہایت مشکل زمین میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ مطلع ہے۔

ہے عید کے دن دلکشا صحنِ زمیں سطحِ فلک　　اے حبذا صلِّ علےٰ صحنِ زمیں سطحِ فلک

اگر دیوانوں کا الگ الگ ذکر کیا جائے اور اُن کی خصوصیات پر نظر ڈالی جائے تو جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اُستادانہ پہلو سے تغزل میں "گلزار" کا رُتبہ اوّل ہے۔ اس میں غالباً ذوق و غالب کے وقت کا بھی کچھ کلام شامل ہے بہرحال اُن دنوں نسبتہً طبیعت کا شباب تھا اور مضامین اور بیان کے بارے میں تلاش اور احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ "آفتاب" کے زمانے میں طبیعت اُس قدر پابندِ احتیاط نہیں رہی اور مہتاب تو ایک اُمڈا ہُوا دریا ہے جس میں روانیِ طبع کا تلاطم زوروں پر ہے۔ غالباً اسی زمانے میں وُہ حال ہو گا جو ان کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ سرِ محفل بلا تامل و تفکرِ بسیار غزل کہا کرتے تھے اور شاگرد لکھتے جاتے تھے۔

متفرقات میں مرزا داغ نے قطعاتِ تاریخ سہرے سلام رُباعیات اور تضمینیں لکھی ہیں تاریخ کے مادے نہایت برجستہ اور برمحل ہیں اور اکثر بلا تعمیہ و تخرجہ ہیں۔

مرزا داغ نے فریادِ داغ نام ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔ یہ مثنوی زبان اور بیان کے لحاظ سے لاجواب ہے اور ایک بڑی خوبی اس میں یہ ہے کہ گو حُسن و عشق کی ایک زندہ تصویر ہے مگر فحش نظارے اس میں نہیں دکھائے گئے۔ جیسا کہ بعض مشہور مثنویوں میں کیا گیا ہے کہ ہاتھا پائی تک کے مضامین درج کئے گئے ہیں۔ ذوق و شوق کی رنگین تصویریں ہیں۔ ہجر و وصل کے تذکرے ہیں مگر تہذیب کے ساتھ۔ حُسن و ادا کے دلفریب نظارے ہیں مگر شائستگی کے ساتھ اختلاط اور نوک جوک کے مضامین ہیں مگر کنایہ کا انداز لئے ہُوئے۔ غرض ایک نہایت چیدہ مثنوی ہے جو بجائے خود اپنے مُصنّف کی اُستادی کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

مُعاصرین کے ساتھ اساتذہ کے کلام کے مقابلے اکثر کئے جایا کرتے ہیں۔ اور داغ اور امیر کے مقابلے لوگوں نے اب سے پہلے کئے ہیں۔ مقابلہ ہو سکتا ہے۔ خاصکر اس لئے

باوجود اس کے جو بات اپنے محبوبِ خاص میں ہو وُہ بات کسی اَور میں کہاں - فرمایا ہے اور کس سادگی اور بے ساختہ پن سے فرمایا ہے۔

تم پہ عاشق نہ ہُوں تو ہوں کس پر
تم میں جو بات ہے وہ ہے کس میں

وطن کی یاد کے شعر جابجا ملتے ہیں - واقعی دہلی (اور اُس زمانے کی دہلی سے نکل کر کوئی دہلی کو بھلا کیونکر سکتا ہے؟ ایک دو شعر لکھے جاتے ہیں:۔

جہاں آباد ہر منزل ہے اَے داغ
قدم باہر نکالا جب مکاں سے

اَے داغ ہم نہایت سمجھے اُسے غنیمت
جو دم خوشی سے گذرا یارانِ ہم وطن میں

اور اس شعر میں ذرا گرے ہوتے مُلاحظہ طلب ہے۔

گرے ہوتے اُلجھکر آستاں سے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

بے تکلف بیان کی ایک بانکی مثال مُلاحظہ ہو - فرمایا ہے:۔

ترے ظلمِ پنہاں ابھی کون جانے
فقط آسماں آسماں ہو رہا ہے

سُنوں کیا خبر جشنِ عشرت کی قاصد
جہاں ہو رہا ہے وہاں ہو رہا ہے

یہ بیہوشیاں داغ یہ خوابِ غفلت
خبر بھی ہے جو کچھ وہاں ہو رہا ہے

ذرا شوخی کے ایک دو نمونے دیکھئے - لکھا ہے:۔

پوچھو جناب داغ کی ہم سے شرارتیں
کیا سر جھکائے بیٹھے ہیں حضرت غریب سے

ہونگے حورانِ بہشتی کے پُرانے انداز
آپ کی بات نئی گھات نئی گات نئی

جس میں لاکھوں برس کی حُوریں ہوں
ایسی جنت کو کیا کرے کوئی

مجھ کو یہ دعویٰ کوئی تیرے سوا دل میں نہیں
اُس کا یہ الزام اچھی نیند تنہائی ہُوئی

استفہامِ انکاری کا خاص انداز قابلِ غور ہے - لکھتے ہیں:۔

لے ہی تو آئیں گے اُسے ہمدم؟
مرے ہی نام سے تو لئے گا؟

ساقیا مجھ سے بادہ کش کو سرور — ایک ہی جام سے تو آئے گا؟

جامہ زیبی کی تعریف کیا بے ساختہ پن سے کی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

اللہ رے جامہ زیب تری جامہ زیبیاں — پہنا جو تو نے رنگ وہی رنگ کھل گیا

بیتابیٔ شوق کی نسبت فرمایا ہے۔ اور کیا خوب فرمایا ہے:-

مزا جو اضطرابِ شوق سے حاصل ہو عاشق کو — وہ تسلیم و رضا و بندگی سے ہو نہیں سکتا

اور کیا خوب کہا ہے:-

کیا ذوق ہو کیا شوق ہے سو مرتبہ دیکھوں — پھر بھی یہ کہوں جلوۂ جاناں نہیں دیکھا
جو دیکھتے ہیں دیکھنے والے ترے انداز — تو نے وہ تماشا ہی مری جاں نہیں دیکھا
ملتا نہیں ہم کو دلِ گم گشتہ ہمارا — تو نے تو کہیں اے غمِ جاناں نہیں دیکھا؟

مرزا داغ کے کلام کی رنگا رنگی ایسی ہے کہ انسان کس کس شعر کو انتخاب کرے اور ایسے مختصر مضمون میں کن کن امور پر بحث کرے۔ ہم خوب سمجھتے ہیں کہ بہت سے بحث طلب اور لطیف امور ہنوز باقی ہیں جن کا اس مضمون میں ذکر تک نہیں ہو سکا۔ مگر اس میں اسی قدر گنجائش تھی۔ انشاء اللہ آئندہ موقع پر ہم پھر مرزا داغ کے کلام کی نسبت کچھ لکھیں گے اور بہت شرح و بسط کے ساتھ لکھیں گے ❖

نیرنگ

غزلِ شاد

تھکے ماندے لحد میں ہم تو مرنے کو آئے ہیں — فرشتے کہتے ہیں اُٹھیے تو کچھ کہنے کو آئے ہیں
فلک ہر دم کے پیسے یا گلا گھونٹے زمیں اپنا — بہ مجبوری رہیں گے کیونکہ ہم رہنے کو آئے ہیں
کسی کا شاد کچھ مطلب کسی کی آرزو کچھ ہے — عدم سے ہم تو اس دُنیا میں مرنے کو آئے ہیں

انسان و انسانیّت

آؤ غور کریں!

اِس عرصۂ اِحتیاج میں جسے دُنیا کہتے ہیں۔ بشر، انسان اس چھوٹی سی مسافتِ فانیہ کو جس کا نام حیات ہے طے کرتے وقت کیا کیا کرتا ہے؟

طرح طرح کی بلاؤں طرح طرح کی احتیاجات کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور اپنی جان شیریں کو زندگی کی موجوں اور تھپیڑوں سے بچانے کے لئے دلیرانہ کوشش وسعی کرتا ہے۔ ہر وقت اور ہر زمان اس کی راحتِ موقتہ کو برباد کرنے کے لئے اژدہائے احتیاج اس پر حملہ کرتا ہے اور یہ اپنے ضعیف بازوؤں سے اُس کا مقابلہ کرتا ہے اور دمِ واپسیں تک اس کے سامنے اظہارِ عجز ومغلوبیت کرنے سے شرماتا ہے۔ اپنی خواہشیں اور ضرورتیں پُوری کرنے کے لئے کُرۂ ارض میں چھپے ہُوئے موادِ طبیعی کو ہزاروں مشکل ترکیبوں کے ساتھ نکالتا ہے۔ پھر تاکہ یہ موادِ طبیعی استعمال کے قابل ہو جائے۔ اپنے قوائے فکریہ کو قوائے طبیعہ کا مطیع کر کے منتخب منتخب صنعتیں اور اقسام اقسام کی ہنرکاری پیدا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔

وُہ آفتِ سماوی جس کا نام بجلی ہے۔ اور جس کے مقابلے میں ہزار دستہ فوج کی شجاعت و بسالت بیکار ہے۔ اُسے ایک حیلہ باز لوہے کے ٹکڑے پر عاشق کر کے دو کوڑی کی تار کے ذریعے سے اسفل السافلین میں پہنچا دیتا ہے۔

اقصائے غرب کے عالمِ ذوق کے دلربا صحن میں ایک مغنیہ خوش صدا کی الحان رُوح افزا کو ظلمتِ شرق (!) کے خوابِ غفلت میں سونیوالی مخلوق کو جگانے (یا اور سلانے؟) کے لئے

فونوگراف" نام آلے کے ذریعے سے پہنچاتا ہے۔ کرۂ ارض کے مقامات بعیدہ میں جو حادثات اور واقعات ہوتے ہیں۔ نئے نئے اور عجیب طریقوں سے طے زمان کرکے انہیں دنیا کے ہر حصہ میں پہنچاتا ہے۔

دُنیا کے قطعات مختلفہ میں جو اقوام و ملل آباد ہیں اُن کی مساعی سے ایک دُوسرے کو مستفید کرنے کے لئے اجسامِ کثیفہ کو بخار نام جسمِ لطیف میں تبدیل کر کے عمان وحشت اور بیابان وحشت پر دوڑتا پھرتا ہے اور اس طرح صنعت کے معجزے ظاہر کرتا ہے۔

پھر زمانِ حاضر کے حالات جاننے ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ قعر زمین میں گھُس کر ہم سے لاکھوں برس پہلے زندہ رہنے والی مخلوق کی ہڈیوں کو اُکھاڑ کر ان کے حالات معلوم کرتا ہے اپنی بنیاد سفلی پر نظر نہیں کرتا۔ نہ اس پہ اکتفا کرتا ہے کہ دُنیا ہی کی باتوں میں مشغول رہے بلکہ اپنے خیال قاصرہ کو اُونچا کرتا ہے اور فضائے نامتناہی کے اجزام کے حجم اور ثقل کو تولتا ہی اور آخر پھر اس دُنیا کی مخلوق ہے نا؟ اجرامِ فلکی کے نام شیر بکری وغیرہ یہیں کے حیوانات کے اُوپر رکھتا ہے۔

پھر ان عجیب و غریب مشاغل کے ساتھ ساتھ دل میں یہ دبدا کرکے کہ بعد موت جانے کیا ہو۔ جزائے محشر میں کہیں نہ پھنسوں، دین کی طرف توجہ کرتا ہے اور نماز اور تسبیح کے ذریعے سے ذخیرۂ آخرت جمع کرنا چاہتا ہے۔ مگر حیرت اس بات پر ہو کہ قدما نے اس بات کا خیال نہ کیا کہ یہ مخلوق گو ضعیف اور عاجز ہے تاہم حیرت انگیز کام کر سکتی ہے۔

متقدمین نے انسان کی یہ تعریف کی ہے کہ وُہ ناطق ہے اور دو پاؤں پر چلتا ہے۔ حالانکہ لا تعداد حیوان اس تعریف کے موضوع ہو سکتے ہیں۔

عجائب!!! اگر ہر مستقیم القامت کو انسان کہنا پڑے تو افریقا کے صحرائی وحشت میں جو درختوں پر رہتے ہیں اور مستقیم القامت ہیں وُہ بھی انسان ہیں؎

اور قطب کے منجمد سمندر پر دو پاؤں سے چلنے والے بہائم وُہ بھی تو انسان ہیں۔

ناطق ؟ کچی مچھلیاں یا ایک دُوسرے کو کھانے والے جزائر بحرالکاہل کے باشندے وہ بھی انسان ہیں ؟ یہ کیسی نا انصافی ہے کہ میل ترقی، ہوس معالی۔ حفظ ناموس وغیرہ ممتاز خصائل کے بجائے انسان کی تعریف اُن صفات سے کیجائے جو اُسے حیوانوں سے ملادیں یہ تعریف افراد کی جامع اور ضد کی مانع نہیں ہے۔

اگر انسانیت قوتِ ناطقہ سے عبارت ہوتی تو جو مُنہہ سے کچھ بھی نکال سکے جھوٹ حسد گالی سَبّ وشتم غرضکہ گونگا اور محض بے زبان نہ ہو وُہ انسان ہے۔

اور اگر انسانیت پاؤں پر چلنے سے مراد ہے تو جو اپنے قدم سے چل کے چوری کرے قتل کرے۔ افعالِ شنیعہ کا مرتکب ہو۔ بس لنگڑا لولا نہ ہو وُہ انسان ہے اور انسانیت پر اُس سے کوئی دھبا نہیں آتا۔

نہیں !

انسان وُہ ہے جو فضائلِ اخلاق کی کوشش کرے اور اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کو رفع کرے مگر دائرۂ مشروعہ سے نہ نکلے۔ ہر وقت قدم آگے ڈالے مگر حفظِ ناموس کے لئے ابنائے جنس کی معاونت کے لئے جماعت کی رفاہ وسعادت کے لئے۔

انسانیت نہایت قیمتی مگر نہایت نازک پارۂ الماس ہے جو خلافِ اخلاق ذراسی حرکت سے خزف پارۂ رذالت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

انسانیت ایک لطیف اور صاف آبِ حیات ہے جو کہ خلافِ ناموس ایک قطرے سے ملکز زہر قاتل ہو جاتا ہے

. . . .

آؤ کوشش کریں فضائل کا اکتساب اور رذائل سے اجتناب کریں اور اپنے تئیں انسان بنائیں۔

(ترجمہ از ترکی محررۂ علی سیدی بک)

یلدرم (از بغداد)

وادیٔ خیال کا شیدا

"خیالات تو کچھ خدا نے شاعرانہ ہی دیئے تھے مگر افسوس ان کے ظاہر کرنے کے لئے زبان نہ دی تھی۔ دُنیا کے اُلجھنوں سے میرے خیالات کی بلند پروازی میں رکاوٹ ہوتی تھی۔ میرے عزیز و اقارب اُن لوگوں میں سے تھے جن میں نہ حس ہوتی ہے نہ ولولہ۔ نہ گھر کے باہر مجھے کوئی آدمی ایسا سُجھائی دیتا تھا جس کا مذاق مجھ سا ہو یا میرے اور اس کے خیالات میں کچھ تشابہ ہو جو باہمی ہمدردی کا سبب ہو سکے۔ دوستی کے تعلقات سے مَیں پرہیز کرتا تھا اور اس لئے کہ اس میں تغیّر اور تلوّن کا قطعی اندیشہ ہے۔ محبّت کے معاملے میں مجھے شکست ہو چکی تھی اور مَیں مایوس تھا اِس لئے کہ واقعات کی صداقت میری بلندیِ نظر تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ بچپن میں وادیِ خیال کی گود میں پلا اِس لئے طبیعت لااُبالی اور دلیر تھی۔ زندگی کے روزانہ جھگڑے بدمزہ معلوم ہوتے تھے۔ ہاں البتہ سُستی جو شاعرانہ مزاج کا خاصہ ہے دِل کو بہت بھاتی تھی۔ اُس سرگرمی اور مستعدی سے جو آدمی سے کچھ کرا لیتی ہے طبعاً کچھ لگاؤ نہ تھا۔ بس عالمِ خیال ایک دل پسند سیرگاہ تھی۔ دوپہر کے وقت کسی بہتے ہوئے چشمے کے کنارے درختوں کے نیچے سبز گھاس پر لوٹنا اور غنودگی کے عالم میں سُورج کی شعاعوں کے سامنے خیالی تصویریں بنانا دِل کی انتہائی آرزو تھی۔ دماغ میں وُہ بے ترتیب فلسفہ سمایا ہُوا تھا جو ہمارے فرقے کا حصّہ ہے۔ عالمِ وجُود میں جو رنگینی مجھے میسّر نہ آتی تھی وُہ مَیں اس غیر محسوس عالم میں تلاش کیا کرتا تھا۔ دِل کے افعال پر نظر کرتے کرتے آخر ایک دِن میری سمجھ میں آیا کہ عالمِ خواب اگرچہ بے ترتیب اور نامکمل ہو مگر ایک جُداگانہ عالم ہے۔ اور یہ ممکن ہے کہ اس کے ابتر غیر محسوس مادے سے حُسن، عظمت اور محبّت کی ایسی مِن بھاتی تصویریں بنائی جائیں

جن کا حقیقی طور پر میسّر آنا میری قسمت میں لکھا ہی نہیں - جونہی یہ بات دل میں گذری مَیں نے ذرا غور کیا اور توجہ اُس طرف پھیری کہ قوّت متخیلہ نے وُہ ہی معجزہ کر دکھایا جس کا مَیں خواہشمند تھا - رات کو نیند آنے سے پہلے خیالات کا ایک خاص مرکز قرار دیکر اس پر توجہ اور غور سے سوچنا اور جسم کو دن بھر حرکت دے آرام میں رکھنا - اور دُنیا کے ایسے قصّیوں سے الگ رہنا جنکی یاد اُن واقعات کی رَو کو روکے یا برہم کرے جن کا وجُود مَیں عالمِ خواب میں چاہتا تھا - آخر کار مجھے معلوم ہؤا کہ ان سب باتوں سے مَیں ایک ایسی زندگی بسر کر سکتا ہُوں - جو محض خیالی ہو اور دِن کی زندگی سے بالکل جداگانہ ہو - رات کے اندھیرے میں قلعے محل - جائداد - اور حکومت سب کچھ نظر آنے لگیں - جواہرات سے جڑے ہُوئے پیالوں میں انگوری شراب میں مزے لے لے کر پیتا تھا - ہؤا کے پردے آسمانی راگ کے سُروں سے بھرے ہُوئے تھے - اور لازوال حُسن کا تبسّم بجلی کی طرح دل پر کوند جاتا تھا - وُہ عظمت اور بلندی جو مجھے جاگتے ہُوئے دن میں میسّر نہ آسکتی تھی عالمِ خواب میں نہایت آسانی سے حاصل ہو جاتی کبھی تو مَیں جنوں کے ساتھ عالمِ ہوائی کی سیر کرتا تھا اور کبھی میں بالشتیوں کے ہمراہ زمین کے طبقے اُلٹتا پھرتا تھا ....

....

مگر مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں صرف ایک صُورت ایسی پیاری ذہن میں نہ آجائے - جس سے میرے دل کا تمام جذبۂ اُلفت ختم ہو جائے - مَیں ڈرتا تھا کہ کہیں خواب کوئی ایسی تصویر نہ دکھا دے جس سے بہتر وہ پھر نہ لا سکے اور یہ نئی دُنیا جس پر میری خوشی مبنی تھی کہیں ویران نہ ہو جائے - مَیں کانپتا تھا کہ کہیں ایسی دل کش صُورت کا مَیں متوالا نہ ہو جاؤں جس کا وجُود رات کے ساتھ ہی ختم ہو جائے -

اِس سلسلۂ خیالات میں مَیں نے سوچا - کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک خواب کو دُوسرے خواب سے

تعلق رہے۔ اور وُہ رشتہ بھی مل جائے جس کی کمی ہے یعنی ایک رات دُوسری رات کے سلسلہ خیالات کو جاری رکھے اور وُہی صُورتیں اور وُہی مناظر آنکھوں کے سامنے پھر پھرلائے جو گذشتہ رات میں تھے۔ اور اِس طرح ایک مسلسل اور باترتیب زندگی کا لُطف آئے اِس بات کے سُوجھتے ہی میں نے فوراً اِس پر عمل کرنا شروع کیا۔ دِن میں دروازے بند کرکے میں بیٹھ گیا۔ کتابوں کو پھینکدیا۔ سُورج کی روشنی سے مُنہہ پھیرلیا۔ اور اپنے خیالات کو صرف ایک طرف رجُوع کیا۔ تاکہ قوّتِ متخیّلہ (خواب خیالات کا آئینہ ہے) اپنے کام کا سلسلہ ایک رات سے دوسری رات تک جاری رکھے۔ ایک یا دو دن نہیں بلکہ مہینوں میں نے اس نظام پر عمل کیا اور مجھے خاطرخواہ کامیابی ہُوئی۔ کون کہ سکتا ہے کہ میری خوشی کیا اور کس قسم کی تھی؟ جب میں نے پہلے پہل اپنے خواب میں ایک ترتیب اور سلسلہ معلوم کیا۔ اوّل اوّل خیالات میں تھوڑا اور جزوی تعلّق تھا۔ میری آنکھ صرف چند صُورتوں کو پہچانتی تھی اور میرا کان صرف چند آوازوں سے آشنا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اُن کی تعداد بڑھتی گئی اور اُن کی شکلیں صاف نظر آنے لگیں۔ آخر کار ایک خوشنما دلفریب چہرہ ان صُورتوں میں ملکر کبھی کبھی اپنی جھلک دکھاجایا کرتا۔ جیسے گھٹاٹوپ بادلوں میں پیارا چاند کبھی کبھی اپنی منوّر جھلک دِکھاکر غائب ہوجاتا ہے اور منتظر چکور کو ایک دُوسرے دیدار کا اُمیدوار چھوڑجاتا ہے۔ قریب قریب ایسا ہی اثر اُس چاند سی صُورت کا میرے دِل پر بھی ہوتا تھا۔ میری حیرانی بڑھنے لگی۔ اور اُس خوبصُورت آنکھوں والے روشن چہرے نے جس کے نقش ونگار آسمان مخلوق کے سے تھے میرے دِل میں ایک حرکت پیدا کی اور اُن تمام مردہ جذبات کو جِلا دیا۔ جن کی قوّتِ فاعلہ قریب قریب زائل ہُوچکی تھی۔ اور یہ کام بلاشُبہ حقیقی انسانی وجود کی طاقت سے باہر تھا۔ میں اِس دل لُبھانے والی صُورت کا شیدا تھا۔ اور میرا اضطراب ہر گھڑی بڑھتا جاتا تھا۔ یہانتک کہ میں اس خیالی محبوب سے اپنی بیتابی اور شوق کا اظہار

کرتا - اور زیادہ بیچینی کی حالت میں اُس کے پاؤں پر گرتا - اور اِن سب میرے افعال کا دل خوش کن نتیجہ یہ ہوتا - کہ ہم ایک دُوسرے سے اقرارِ محبّت کرتے - کہ اتنے میں منحوس صبح ہمارے راز ونیاز کی باتوں میں مخل ہوتی - اور ہم پھر رات کو ملنے کا وعدہ کرتے ہُوئے جُدا ہوجاتے - اس طرح مَیں ایک ایسی دُنیا میں رہتا تھا جس کو اس ظاہری دُنیا سے کچھ مناسبت نہ تھی -

مَیں سمجھتا تھا کہ مَیں کسی مشرقی جزیرے کا بادشاہ ہُوں جس کی آب وہوا میرے سرد وطن سے کچھ مشابہت نہ رکھتی تھی - دِن کو تو افسوس اس بے مزہ دُنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا اور وُہ صُورتیں میرے سامنے آتی تھیں جو میری خوشی کو ذرّہ برابر بھی نہ بڑھا سکتی تھیں - وُہی بے رونق آسمان اور وُہی تپش والا سُورج نظر پڑتا - مگر رات ہزاروں دمکنے والے پیارے ستاروں سے آسمان کی چھت کو منوّر کرتی اور شیریں نیند کی اوس سے مُرجھائے ہُوئے دِلوں کو تازہ کرتی آتی - اور مجھے ایک نئی دُنیا میں لیجاتی - سر سبز باغات میں رنگا رنگ کے دل کش پھول اور خوشرنگ مزیدار میوے درختوں کی ٹہنیوں میں لٹکتے ہُوئے ایک عجیب بہار دیتے تھے - بلند بلند محل - جن کی خوبصورتی مشرقی وضع کے ہزاروں محرابوں - میناروں اور بُرجیوں پر مبنی تھی اور جن کی دیواروں سے دریا کا شفاف پانی ٹکراتا ہوا بہتا تھا - میرے مسکن تھے - پرندوں کے چہچہے خصُوصًا مشرقی بلبل کا دلفریب راگ دل کو لبھانے والا ہوتا تھا - میرے وزیر مشیر بلحاظ صُورت - لباس - اور زبان کے مجھ سے بالکل جُدا تھے - کبھی کبھی مَیں اپنے ہمسایہ بادشاہوں سے لڑ بھی پڑتا - اور بعض دفعہ شیر کے شکار میں وسیع جنگل روندتا پھرتا - غرض میری زندگی شان وشوکت سے بسر ہوتی تھی لیکن ان سب سے زیادہ دلچسپ میری محبت کی داستان تھی - حضرتِ عشق کی دشوار گزار راہیں - حصُولِ تمنّا میں صدہا قسم کی رکاوٹیں - رقیبوں سے جنگ وجدل غرض لاکھوں آفتیں

تھیں جن سے پالا پڑا - آخر کار ان سب مصیبتوں کے بعد - لو - وُہ میری تمنّا بر آئی - میرا مُدعا پُورا ہو گیا - اور مَیں نے اُس کی محبّت حاصل کر لی -

اس عجیب دُنیا میں وقت اس قدر جلد نہیں گذرتا جیسا کہ حقیقی دُنیا میں - وہاں ایک ساعت میں اتنے واقعات گزرتے ہیں - جتنے اس دُنیا کے ایک برس میں - کاش یہ خوشگوار خواب ہی حقیقی زندگی ہوتا ! اور یہ بے لذت بیداری حقیقی آرام سے بدل جاتی ! کیوں نہیں ؟ کونسی بات اس دُنیا میں ایسی ہے جو اُس میں نہیں ؟ فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ اس دُنیا میں ہم خوشی کے منتظر رہتے ہیں - اور اکثر ہماری خوشی کسی شَے پر منحصر ہوتی ہے - مگر اس عجیب دنیا میں خوشی ہمارا انتظار کرتی ہے اور ہم اپنے مذاق کے موافق جس قدر چاہیں اپنی خوشی کو گھٹا بڑھا سکتے ہیں - پس مجھے وُہ تمام خوشی حاصل ہُوئی جو میرے ذہن میں آسکتی تھی - اب مجھے اس ظاہری دُنیا کی کوئی چیز نہیں بھاتی - مَیں تعلّقات نہیں پیدا کرنا چاہتا - میری سچّی محبت کا مستحق اس دُنیا میں مجھے کوئی نظر نہیں آتا - لوگوں سے راہ و رسم میرے دل کے اطمینان کو زائل کر دیتی ہے - غرض میری کوئی آرزو نہیں جس کے اس دُنیا میں پُورا ہونے کی خواہش کروں میں تو بس اس ساعت کا منتظر رہتا ہُوں جس وقت مَیں اپنی دل پسند خیالی دُنیا میں جا داخل ہُوں - میرے دل کو اُس وقت وُہ مسرّت ہوتی ہے جو انتہائی درجہ کی کہی جا سکتی ہے - پس میری دُنیا نے مجھے وُہ کچھ دیا - جس سے اس دُنیا نے قطعی انکار کر دیا تھا -

. . . .

. . . .

. . . .

"ہیں! یہ کیا ہوا ؟ یہ کیسی مُصیبت آئی ؟ ہائے - مَیں تباہ ہو گیا ! میری دُنیا ویران ہو گئی ! میرے دل کی خوشی ہمیشہ کے لئے گئی - افسوس ! موت اُسے نگل گئی جو میری محبت کا مرکز اور

میری خوشی کا سرچشمہ تھی۔ آہ! جان کنی کے وقت وُہ میرے اِن ہاتھوں میں تھی! کیا یہ خواب ہے؟ نہیں یہ تو حقیقی واقعہ سے بھی زیادہ مجھے تکلیف دہ ہے۔ کیا کیا۔ اُسے۔ اُسے دیکھنا مجھے پھر نصیب ہوگا؟ کیا ان میرے ہاتھوں نے اُسے کفن پہنا کر گور میں لٹایا ہے؟ میرا رنج اب لازوال ہے اور میری خوشی اب دائمی طور پر مفقود ہوگئی! اب کونسی صورت میری خیالی دنیا میں میرا دل بہلا سکتی ہے؟ افسوس! اس دُنیا میں تو ہر شے کو فنا ہے مگر کیا خیالی دنیا بھی اسی طرح ختم ہو جانے والی ہے؟ ہاں بیشک! خیال بھی ایک خاص حد رکھتا ہے اور اُس کے بعد اُس کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر نہیں۔ مگر نہیں۔ ابھی اُمید باقی ہے! اس دُنیا میں جی کر مَیں کیا کرونگا۔ مَیں بھی اُسی دُنیا میں کیوں نہ چلا جاؤں جس میں میری وُہ سیر کر رہی ہوگی؟ موت یقیناً ایک نہ ایک دن آنے والی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ وُہ اسیوقت ہی نہ آئے"۔

یہ کہہ کر وادیِ خیال کا شیدا رونے لگا۔ چند ہی گھنٹوں میں اس کی حالت متغیر ہوگئی۔ موت کی آمد کے خیال نے اُسے دبا لیا۔ اور آخر اُس کی قوتِ خیال نے اُسے بھی اُسی عالم میں پہنچایا جہاں وُہ جانا چاہتا تھا۔

یہ مرحوم شہیدِ خیال کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

لطیف احمد

ایسا نہیں کہ پہلے سے وُہ جانتے نہیں
کچھ عرض جب سے کی مجھے پہچانتے نہیں

کر گذرے عین وقت پہ جو ہم سے بن پڑا
پہلے سے دِل میں بات کوئی ٹھانتے نہیں

واعظ کو اختیار ہے چاہے کرے ملال
ہم تو کلام حق کو بُرا مانتے نہیں

رندوں کا بھی خیال ہے ساقی کا بھی لحاظ
پی لیتے ہیں اُٹھا کے کبھی چھانتے نہیں

جس پر مرے لہو کی نہ چھینٹیں ہوں اسکو ہم
دامن قبائے یار کا گردانتے نہیں

اے شاد جنکے ساتھ زمانہ بسر کیا
اللہ اب وہی مجھے پہچانتے نہیں

داغ

عظمتِ غالب ہے اک مُدت سے پیوندِ زمیں　　مہدی مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر　　چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر

آج لیکن ہم نوا سارا چمن ماتم میں ہے　　شمعِ روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے

چل بسا داغ آہ! میت اسکی زیبِ دوش ہے

آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وُہ بانکپن وُہ شوخیِ طرزِ بیاں　　آگ تھی کافورِ پیری میں جوانی کی نہاں

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے　　یعنی یہ لیلا وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

اب صبا سے کون پوچھیگا سکوتِ گل کا راز　　کون سمجھیگا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں　　آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

جوہرِ رنگیں نوائی پا چکا جس دم کمال　　پھر نہ ہو سکتی تھی ممکن میر و مرزا کی مثال

کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر　　داغ یعنی وصلِ فکرِ میرزا و درد و میر

شعر کا کاشانہ لیکن آج پھر ویراں ہوا　　دیدۂ خونبار پھر منت کشِ داماں ہوا

بلبلِ دہلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں　　ہم نوا ہیں سب عنادل باغِ ہستی کے جہاں

کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدا کی خامشی

آہ! دل سوزی تو تھی گو نکتہ آموزی نہ تھی

اور دکھلائینگے مضموں کی ہمیں باریکیاں　　اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں

تلخیِ دوراں کے نقشے کھینچکر رلوائینگے　　یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائینگے

اس چمن میں ہونگے پیدا بلبلِ شیراز بھی　　سیکڑوں ساحر بھی ہونگے صاحبِ اعجاز بھی
اُٹھینگے آذر ہزاروں شعر کے بتخانے سے　　مے پلا ئینگے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائینگی کتابِ دل کی تفسیریں بہت　　ہونگی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

ہوبہو کھینچیگا لیکن عشق کی تصویر کون
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں　　تو بھی رو اے خاکِ دلّی داغ کو روتا ہوں میں
آہ اے بیت الحرامِ مذہبِ اہلِ سخن　　ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن
وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا　　یعنی خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا
تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں　　وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں
اُٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا　　یادگارِ بزمِ دہلی ایک حالی رہ گیا
آرزو کو خون رلواتی ہے بیدادِ اجل　　مارتا ہے تیر تاریکی میں صیّادِ اجل
کھل نہیں سکتی شکایت کے لئے لیکن زباں　　ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں

ایک ہی قانونِ عالمگیر کے ہیں سب اثر
بُوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دُنیا سے سفر

اقبال

کلامِ اکبر

خدا جزائے خیر دے خان بہادر سید اکبر حسین کو - کیا طبیعت پائی ہے - اُن کے کلام کا اشتیاق عام ہے - خلعتِ قبول ہر ایک کا حصہ نہیں ہوتا - خوش قسمت ہیں وُہ جنہیں یہ امتیاز حاصل ہوّا - سید موصوف کو آنکھ کی بیماری نے مجبور کر رکھا ہے - ورنہ ملک کے علمی ذخیرے میں معتد بہ اضافہ آج تک کر چکتے - اب بھی اُن کی ذات سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں - اور باوجود مجبوریوں کے جب قدرتی شاعری جوش زن ہوتی ہے - تو بحرِ خیالاتِ اکبر "موتی اُگلتا ہے - مندرجہ ذیل چند اشعار (ایک نو تصنیف گو ناتمام غزل کے) اُسی سمندر کی ایک لہر ہیں :-

وُہ ہوا نہ رہی وُہ چمن نہ رہا وُہ گلی نہ رہی وُہ حسیں نہ رہے
وُہ فلک نہ رہا وُہ سماں نہ رہا وُہ مکاں نہ رہا وہ مکیں نہ رہے
نہ گُلوں میں گلوں کی سی بُو وُہ رہی - نہ عزیزوں میں لُطف کی خو وُہ رہی
نہ جبینوں میں رنگِ وفا وُہ رہا - کہیں اَور کی کیا وُہ ہمیں نہ رہے
نہ وُہ آن رہی نہ اُمنگ رہی نہ وُہ رندی و زُہد کی جنگ رہی
سُوئے قبلہ نگاہوں کے رُخ نہ رہے - درِ دیر پہ نقشِ جبیں نہ رہے
نہ وُہ جام رہے نہ وُہ مست رہے نہ فدائے عہدِ الست رہے
وُہ طریقۂ کارِ جہاں نہ رہا وُہ مشاغلِ رونقِ دیں نہ رہے
یہ تمہارے ہی دم سے ہے بزمِ طرب ابھی جاؤ نہ تم نہ کرو یہ غضب
کوئی بیٹھ کے لُطف اُٹھائے گا کیا کہ جو رونقِ بزم تمہیں نہ رہے

ہمیں لاکھ زمانہ لبھائے تو کیا نئے رنگ جو چرخ دکھائے تو کیا
یہ محال ہے اہلِ وفا کے لئے غمِ ملّت و اُلفتِ دیں نہ رہے

حال میں جناب اکبر سے ایک دلچسپ خط کتابت اُس اثر کے متعلق ہوئی - جو مغربی ترقی کے شوق سے اہل ہند کے عقاید مذہبی پر پڑتا ہے - اُس کے متعلق ان کے یہ فقرات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں :-

اس ہنگامہ انقلاب اور شانِ ظہورِ علوم و فنون اور زینت بزم یُورپ نے درحقیقت مذہب کو ظاہراً کھو دیا ہے - لیکن میں اس دَورِ فلک کو بدلی کے اُمنڈنے سے تشبیہہ دیتا ہوں

مذہب ہے گُم ترقیؔ یورپ کے سامنے
معذور خاکسار بھی ہے اور جناب بھی
لیکن وُہ آفتاب ہے اور یہ ہے مثلِ ابر
ابرِ غلیظ سے ہے نہاں آفتاب بھی"

ایک اَور رُباعی اس رنگ میں لاجواب ہُوئی ہے -

دولت بھی ہے فلسفہ بھی ہے جاہ بھی ہے
لُطفِ حسنِ بُتانِ دلخواہ بھی ہے
سب سے قطعِ نظر ہے مشکل
اتنا سمجھے رہو کہ اللہ بھی ہے

اکبر

ترکیب بند

مرثیہ حضرت فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی مرحوم

(از احقر التلامذہ احسن مارہروی)

(۱) میری وہ دکھ بھری کہانی ہے جس کو پتھر بھی سن کے پانی ہے
بات کرنی محال ہے گویا کس میں اب طاقتِ لسانی ہے
ہو گیا دل کباب جل بھن کر یہ تپِ سوزشِ نہانی ہے
آج ٹوٹا ہے مجھ پہ غم کا پہاڑ اور کیا وجہِ سرگرانی ہے
ہائے کیا بند ہے یہ رقت کا عید کے روز نوحہ خوانی ہے
کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا کچھ عجب دورِ آسمانی ہے
تھے جہاں میزبانِ عیش و نشاط اب وہاں غم کی میہمانی ہے
بے حلاوت ہے عیشِ دنیا کا ہائے کیا تلخ زندگانی ہے
سو برس تک جیے تو کیا حاصل آخر اک روز موت آنی ہے
ملک الموت کے لئے یکساں پیری و طفلی و جوانی ہے
نہ رہا ہے یہاں نہ کوئی رہے سچ ہے دنیا سرائے فانی ہے

کیا کسی کو خبر ہو دم بھر کی
کہ ہوا پر بنا ہے اس گھر کی

(۲) بے ثباتی جہان کی دیکھی کچھ نہ خیر اپنی جان کی دیکھی
ہے سرائے جہاں عجیب جگہ طرز نو اس مکان کی دیکھی

کوئی جی بھر کے رہ نہیں سکتا | رسم یہ اس جہان کی دیکھی
شکل بے مہریِ فلک کے سوا | نہ کسی مہربان کی دیکھی
ہائے دو بھر ہے چار دن رکھنا | ہمت اِس میزبان کی دیکھی؟
چال سیدھی کبھی نہیں چلتا | کج روی آسمان کی دیکھی
آگیا وقت موت کا جس دم | پھر نہ مہلت اِک آن کی دیکھی
زیر ہو دیوِ مرگ ۔ یہ طاقت | نہ کسی پہلوان کی دیکھی
عقل سمجھے نہ اس کی باتوں کو | نہ رسائی گمان کی دیکھی
ہم نے لاش آج بے نشاں ہوتے | ایک عالی نشان کی دیکھی
نہ رہا میرِ لشکرِ اُردو | یہ تباہی زبان کی دیکھی

آج راہیؔ جہاں سے داغ ہوا
خانۂ نظم بے چراغ ہوا

(۲) ہیں عزیزانِ خواجہ تاش کدھر | کیا ابھی تک انہیں نہیں یہ خبر
سائلؔ و خُلقؔ و بارقؔ و ناداںؔ | رنجؔ و آزادؔ و وارثؔ و اخترؔ
واصفیؔ و عزیزؔ طیشؔ و خیالؔ | نوحؔ و آہؔ و مُبارکؔ و انورؔ
بیخودؔ و اشکؔ و حسرتؔ و بیباکؔ | برقؔ و فوقؔ و متینؔ و عشقؔ و شررؔ
حسنؔ و عیشؔ و جالبؔ و اقبالؔ | شاعرؔ و شوخؔ و فاخرؔ و گوہرؔ
شرفؔ و عالمؔ و انیقؔ و دلیرؔ | باغؔ و توقیرؔ و مہرؔ و نجمؔ و قمرؔ
المؔ و شاہیؔ و رساؔ و ضیاؔ | شمسؔ و محفوظؔ و ثاقبؔ و احقرؔ
بسملؔ و حیرتؔ و نسیمؔ و ذبیحؔ | صبرؔ و شوقؔ و دلؔ و بشیرؔ و بشرؔ
وجدؔ و افسونؔ و جادوؔ و بیدارؔ | ہجرؔ و احسانؔ و رحمتؔ و افسرؔ

رشک و زار و سعادت و بیتاب	انجم و ثابت و جلال و اثر
آئیں اور آکے اس طرح سب لوگ	روئیں احسن کے ساتھ مل جل کر

خارِ حسرت بیان سے نکلے
دل کا کانٹا زبان سے نکلے

(۴) تھا جو ہندوستان کا بلبل	پڑ گیا اس پہ موت کا چنگل
جس کی باتوں میں پھول جھڑتے تھے	ہائے اُس کا چراغ آج ہے گُل
گلِ مضموں تھے جس کے دل میں بھرے	اُس کی تُربت ہے زیرِ چادرِ گُل
شہرہ تھا جس کی نغمہ سنجی کا	اُس کے ماتم کا ہر طرف ہے غُل
پیہم اس طرح شورِ ماتم ہے	شیشۂ مے کی جس طرح قلقل
شاعری کا لطیف رنگ گیا	ہو گیا آج خاتمہ بالکل
تھے وہ اس کے تصوّر و تخییل	بے پیئے تھا خمار و نشّۂ مُل
صاف سچّی سی بات کہتا تھا	اُس نے باندھے کبھی نہ جھوٹے پُل
وادیِ شعر جس سے تھی روشن	داغ اب دے گیا وُہ شمعِ سُبُل
فاتحہ خواں رہا جو اوروں کا	ہائے آج اُس کا ہو رہا ہے قُل
تھی خبر یُوں نہ اُس کے مرنے کی	مَوت بے وقت دے گئی یہ جُل

دے دیا رنج اِک جُدائی کا
ستّیاناس ہو جدائی کا

(۵) اُس کی رہ رہ کے آ رہی ہے یاد	بھُولتا ہی نہیں دلِ ناشاد
صُورت آنکھوں میں اُس کی پھرتی ہے	ہائے کیا شخص تھا وہ پاک نژاد
کوئی اُستاد اب کہاں ایسا	دل سے قائل ہوں جس کے سب حُسّاد

کھینچتا تھا وہ یوں خیالی شکل — جس طرح نقش ظاہری بہزاد
وہ نواسنجیاں وہ بات کہاں — اب تو نغمہ ہے صورتِ فریاد
گلشن اردو کا ہو گیا پُر خار — زغن و بوم کو مبارک باد
ہوئی ترکی تمام اردو کی — بے طرح یہ چمن ہوا برباد
کوئی اس کا نگہبان نہیں — سرو شمشاد ہو گئے آزاد
شاعری اور شاعری ایسی — جس کا بانی ہوا جہاں استاد
نہ ہوئی ہے نہ ہو کسی کو نصیب — سر کھپائیں ہزار زشت نہاد
کون کھوٹے کھرے کو پرکھے گا — کوئی ٹکسال کا نہیں نقاد

فرد تھا کائنات میں بس وہ
ایک تھا اپنی بات میں بس وہ

(۶) کوئی ایسا دکھائیے تو سہی — داغِ ثانی بتائیے تو سہی
محض لفاظیاں نہ مانوں گا — لکھ کر ایسا سنائیے تو سہی
جو مٹائے نہ مٹ سکے دل سے — سکّہ جمائیے تو سہی
چاہیے جس جگہ سے پڑھ لیجے — اس کا دیوان لائیے تو سہی
~~لو فرضنا وہ تھا نِرا جاہل~~ — اور ایسا بلائیے تو سہی
ہم بھی دیکھیں وہ عالم و شاعر — نام دو اک گنائیے تو سہی
دوسروں سے مقابلہ کر کے — خفتیں کچھ اٹھائیے تو سہی
چلیے بس ہو چکے بہت دعوے — آنکھ ہم سے ملائیے تو سہی
آپ اور اس کی ہمسری توبہ — اپنی صورت بنائیے تو سہی
بھول سکتا نہیں اسے کوئی — یاد اس کی بھلائیے تو سہی

حشر تک نام اُس کا چمکے گا   داغ کو اب مٹائیے تو سہی
کَون اُس کو مٹانے والا ہے
اس کی باتوں کا بول بالا ہے

(۷) داغ! سکہ بٹھا لیا تو نے   نام پیدا کیا بڑا تو نے
پہلے تھا بے نمک مذاقِ سخن   اب جو ہے یہ دیا مزا تو نے
نظم میں جو لطافتیں کہ نہ تھیں   وُہ بڑھائیں بدرجہا تو نے
تھا نہ صاف آئینہ معانی کا   اُس کو دی ہے مگر جلا تو نے
اک طریقے پہ تھی روش سب کی   رستہ اپنا کیا جُدا تو نے
سب کے سب تھے لکیر ہی کے فقیر   رنگ لیکن نیا بھرا تو نے
تو ہی دراصل تھا جہاں اُستاد   پا لیا یہ لقب بجا تو نے
تھا حقیقت میں تو فصیح الملک   افصح اِک ملک کو کیا تو نے
لشکرِ نظم سے خطاب لیا   ناظمِ یار جنگ کا تو نے
گرچہ آصف ہی معطی الالقاب   اصل یہ ہے جو ہے کہا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا   جو دیا اَے خدا دیا تو نے
آج فخرِ زمانہ کوئی نہیں
اپنے فن میں یگانہ کوئی نہیں

(۸) دل میں مضمون یاس و حسرت کے   بن گئے نقش لوحِ تُربت کے
ہے یہ پُر درد مطلع اُستاد   جس کے الفاظ ہیں قیامت کے
دیکھ کر کل تک اُس کو ٹھنڈک تھی   آج ہیں داغ سوزِ فرقت کے
جیتے جی جائے گا نہ یہ صدمہ   حشر تک دن ہیں اِس مصیبت کے

ہو چکے - ہیں بھی - اور ہونگے بھی
مگر اس طرح کی طبیعت کے

نہ ہوئے ہیں نہ ہوں نہ ہیں - شاعر
جن میں ہوں وصف جامعیت کے

میر و سودا کی طرز تھی اُس میں
ڈھنگ تھے سوز و درد و جرأت کے

چھوٹتا کیا مذاق ذوق اس سے
کہ مزے تھے اُسی کی لذت کے

اکثر اندازِ غالب و مومن
تھے مگر اپنی اپنی رنگت کے

باغِ عالم میں ڈھونڈتے کیا ہو
یہ کرشمے ہیں دستِ قدرت کے

داغ سا دوسرا نہ پاؤ گے
گل ہزاروں ہیں ایک صورت کے

جلوہ اُس کا نظر نہیں آتا
نہیں آتا نظر نہیں آتا

(۹) مر گیا وُہ سخن ورِ دہلی
تھا جو دل سے ثنا گرِ دہلی

تھا وطن گرچہ آنکھ سے اوجھل
دل میں تھا اُس کے منظرِ دہلی

داغ کی وجہ سے زمانے میں
خوب چمکا مقدرِ دہلی

دُور دُور اُس کی روشنی پہنچی
داغ تھا یا کہ خاورِ دہلی

آسماں تھی زمین دلّی کی
تھا وُہ ماہِ منورِ دہلی

جس سے واقف ہو بچہ بچہ تک
کون ایسا ہے اشتہرِ دہلی

خاکساری سے بن گیا سرتاج
وُہ نہ تھا گرچہ افسرِ دہلی

کون ایسا ہے شاہِ ملکِ سخن
تھا وُہی مفخرِ کشورِ دہلی

عمر بھر گرچہ وُہ رہا باہر
تھا مزاج اس کا خوگرِ دہلی

ہے زمینِ دکن بھی قابلِ رشک
جو بنی کانِ جوہرِ دہلی

چھپ گیا داغ کُنجِ مرقد میں
ہے نگوں بختِ اخترِ دہلی

جائے گا اب یہ رنج مشکل سے
ہم کو جینا پڑا مرے دل سے

(۱۰) کم سے کم مطلع تو کرنا تھا — اگر ایسا ہی تجھ کو مرنا تھا
ایک دُنیا پڑی تھی اس کے لئے — کیا تجھی پر اجل کا دھرنا تھا
زندگی تیری کس کو بھاری تھی — تجھ کو برسوں ابھی ٹھہرنا تھا
ہے جوانی پہ گرچہ حُسنِ سخن — پھر بھی اُس کو ابھی نکھرنا تھا
زیورِ معنی و مضامیں سے — کچھ دنوں اور ابھی سنورنا تھا
نقشِ معنی میں ہے کسر باقی — رنگ ابھی اور اُس میں بھرنا تھا
سلک نظم اور اس طرح ٹوٹے — نہ مناسب ابھی بکھرنا تھا
ہیں جو بحرِ سخن میں غرق ابھی — تیرے ہاتھوں انہیں اُبھرنا تھا
گوشۂ قبر میں قدم اپنا — جلد اتنا نہ تجھ کو دھرنا تھا
داغ! مہماں سرائے دُنیا میں — اور چندے قیام کرنا تھا
لیکن افسوس کیا چلے تدبیر — واقعہ یہ یُونہیں گذرنا تھا

زور قسمت سے چل نہیں سکتا
دِل سنبھالے سنبھل نہیں سکتا

(۱۱) اُس نے وہ طبعِ نیک تھی پائی — نہ کبھی جس میں کچھ بدی آئی
نہ کسی سے عناد تھا اُس کو — نہ بنا وُہ کبھی تبرّائی
اُس کو بھائی تھی راستی ایسی — دشمنوں سے بھی کی نہ کج رائی
کیا بہم تھی کٹا چھنی پہلے — کوئی میر ہی تھا کوئی سودائی
آتشی ناسخی کوئی بنتا — مصحفی کوئی۔ کوئی اِنشائی

الغرض شاعری میں اگلوں نے خوب آپس میں کی صف آرائی
اُس نے اپنے معاصروں میں مگر رشک کی آگ تک نہ بھڑکائی
ہجو لکھی نہ اُس نے کوئی کبھی گرچہ گالی - جہان کی کھائی
اُس کے ہم عصر اور ہم فن بھی تھے جنابِ امیرِ مینائی
لیکن آپس میں یُوں رہے مل کر جیسے رکھتے ہوں میل دو بھائی
جس نے دیکھی ہے اس نے دیکھی ہو دونوں کی دوستی و یکجائی

ہجو کی رسم اُٹھا گئے دونوں
اپنی اُلفت دکھا گئے دونوں

(۱۲) داغ کی اور امیر کی اُلفت پا گئی اِک جہان میں شہرت
مدتوں رام پور میں رہ کر متفرق ہُوئے نہ اک ساعت
تیس چالیس سال تک جن کی اِک جگہ ہو قیام کی صُورت
اُن میں کیونکر نہ اتحاد بڑھے کس طرح اُن میں آئے غیریت
رہے آپس میں مثلِ شیر و شکر تلخیِ رشک سے رہی نفرت
جیتے جی جس طرح رہے دونوں یُنہیں باہم رہے پسِ رحلت
ہے یہ یکجی دلیلِ یک جہتی ہے یہ نادر نتیجۂ خُلت
چند دن کے لئے ہُوئے تھے جُدا حشر تک اب رہیں گے ہم صحبت
واہ اے سرزمینِ ملکِ دکن تو نے پائی ہے خوب ہی قسمت
دہلی و لکھنؤ کے دو اختر ہیں نہاں تجھ میں اے فلک رفعت
اُن کے دیدار کی تمنا ہے کاش بر آئے اپنی یہ حسرت

پھر انہیں کوئی لائے گا کہ نہیں

یہ گیا وقت آئے گا کہ نہیں

موت پر کوئی بس نہیں چلتا — قبضۂ دسترس نہیں چلتا
بزمِ دنیا کا لطف کیا تنہا — کام بے چند کس نہیں چلتا
توسنِ عمر پر چلے کیا زور — اس طرح یہ فرس نہیں چلتا
ٹوٹ جاتا ہے قید خانۂ رُوح — تا ابد یہ قفس نہیں چلتا
چاہ عُمرِ دراز کی ہے عبث — اس میں دخلِ ہوس نہیں چلتا
غلغلہ زندگی کا ہے چندے — کچھ بہت یہ جرس نہیں چلتا
جتنی مقدار ہے مقدر میں — اُس سے بڑھ کر نفس نہیں چلتا
سانس جب تک ہے ہے جبھی تک آس — رُک گیا جب تو بس نہیں چلتا
پہلے چلتا ہو شاید اتنا دم — اب ہزاروں برس نہیں چلتا
مرنے جینے پہ کیوں ہے سوچ بچار — اس میں کچھ پیش و پس نہیں چلتا
کچھ پتا مرگ و زندگانی کا — سچ ہے اے دادرس نہیں چلتا

گر مرض ہو دوا کرے کوئی
مرنے والے کا کیا کرے کوئی

الوداع اے کمالِ شعر و سخن — الفراق اے خیالِ خواہشِ فن
کون مضمونِ زلف اب باندھے — کہ طبیعت کو ہے نئی اُلجھن
اب نہ وُہ دل رہا نہ ہے وُہ اُمنگ — نہ وُہ بلبل ہے آہ اب نہ چمن
تازگی باغِ شعر میں ہے کہاں — خشک ہو وُہ ہرا بھرا گلشن
شعر گوئی تھی بات معمولی — اب ہمیں ہو گئی وُہ راہ کٹھن
کیوں نہ یہ راہ ہو کٹھن ہم کو — نہیں اُستاد و رہنمائے زمن

کون رستہ بتانے والا ہے — رہنما اب ہیں صورت رہزن
گرچہ اوروں کے سامنے اب بھی — نہ جھکے گی کسی طرح گردن
پھر بھی استاد کی ضرورت تھی — مانتے جس کی بات ہم حکماً
کون ہے اب سپر ہمارے لئے — کس کے سائے میں ہم رہیں ایمن
ہائے دشمن کو بھی یہ داغ نہ ہو — کیا بُرا وقت وہ بھی تھا احسن

کہ بتاریخ گفت ایں ناشاد
زجہاں رفت آں جہاں استاد
۱۴ ھ ۲۲

احسن

تسکین قلب

مرے چاہنے والے کیوں رو رہے ہیں — یہ جان اپنی کسواسطے کھو رہے ہیں؟
میں مُردہ نہیں ہوں ٹھکانے سے جی کر — کہوں کیا مرے دل کو کیسی خوشی ہے
نہ روئیں۔ نہ روئیں۔ ابھی خشک ہونگے — جو قطرے ہیں رخسار پر آنسوؤں کے
میرا حال سُنکر اُنہیں غم نہ ہوگا — وُہ رنج وتعب اور وُہ ماتم نہ ہوگا
بر آئی ہے مرنے پہ میری تمنا — وہاں پہنچا۔ ملنے کا وعدہ جہاں تھا
خدا نے نصیبوں سے یہ دن دکھائے — ثمر خشک شاخوں میں اب جاکے آئے
یہاں تاج تاروں کا ہی میرے سر پر — کہاں جاکے چمکا ہے میرا مقدر

ٹہلتا ہوں ہر وقت خلدِ بریں میں — محبت کا معدن ہے جس سرزمیں میں

میرے چاہنے والے ہرگز نہ روئیں
غمِ ہجر میں جان اپنی نہ کھوئیں
میرے واسطے رنج اُٹھانے سے حاصل
یہ رونے سے آنسو بہانے سے حاصل

وہاں میرے رہنے کی تھی کون صورت — جہاں تھی مروّت - محبت نہ الفت
گناہوں کا اور موت کا تھا جو مسکن — جہاں ایک صورت میں تھے دوست دشمن
جہاں ابرِ غم تھا - اندھیرا بہت تھا — جہاں جان جانے کا کھٹکا بہت تھا
یہاں کی مگر زندگی - زندگی ہے — سراپا مسرّت مجسّم خوشی ہے
یہاں ناز کرتے ہیں مجھ پر فرشتے — اُٹھے ہر طرف سے ان آنکھوں کے پردے
مکاں ہے مرا جلوہ گاہِ محبّت — میسّر ہے ہر دم کسی کی زیارت
یہ اس مصحفِ رُخ میں لکھا ہوا ہے — "خوشی میں بقا ہے تو بعدِ فنا ہے"
جو پہنچا یہاں تک یہ اُس کی عنایت — خوشا میری قسمت - خوشا میری قسمت!!

میرے چاہنے والے ہرگز نہ روئیں
غمِ ہجر میں جان اپنی نہ کھوئیں
میرے واسطے رنج اُٹھانے سے حاصل
یہ رونے سے آنسو بہانے سے حاصل

وُہ ساعت بھی نزدیک اب آگئی ہے — کہ آنے کی جس کے مجھے بھی خوشی ہے
اُنہیں لائے گا یاں فرشتہ قضا کا — کہ ہو سامنا اس جہاں میں خدا کا
لپٹ کر وُہ اس وقت مجھ سے ملینگے — دُعائیں بڑی دیر تک مجھ کو دینگے

جدائی پھر اُن سے کسی دم نہ ہوگی
کبھی صحبتِ عیش برہم نہ ہوگی

دیارِ جہاں کی بہت خاک اُڑائی
سوا کوفت کے کچھ بھی راحت نہ پائی

ٹھہرنے کے قابل وُہ بستی نہیں ہے
جو سمجھو تو ہستی کی ہستی نہیں ہے

وُہ مانگیں دُعا حق سے ۔ معبُود میرے!
اب اِس دارِ فانی سے جلدی اُٹھا لے

طبیعت یہاں آ کے مسرُور ہوگی
سیاہی شبِ غم کی کافور ہوگی

مرے چاہنے والے ہرگز نہ روئیں
غمِ ہجر میں جان اپنی نہ کھوئیں
میرے واسطے رنج اُٹھانے سے حاصل
یہ رونے سے آنسو بہانے سے حاصل

سجّاد - دہلوی عظیم آبادی

داغ کے پھُول

اے نظم! تیرا عشوۂ دلجو کدھر گیا
سر چڑھ کے بولتا تھا وُہ جادو کدھر گیا

شانہ وہ کیا ہوا - خمِ گیسو کدھر گیا
چوٹی کا پھُول داغ سمن بو کدھر گیا

کلیاں کدھر گئیں ترے دامانِ ناز کی
بُو بھینی بھینی کیا ہوئی زلفِ دراز کی

اے حُسن! تیرا نغمہ اعجاز کیا ہوا
اے عشق! تیرا سوز فزا ساز کیا ہوا

وہ طوطیِ جناں کا ہم آواز کیا ہوا
وہ عندلیبِ زمزمہ پرداز کیا ہوا

وہ صحبتیں۔ وہ انجمن آرائیاں کہاں
وہ آہ! داغ کی چمن آرائیاں کہاں

چبھتے ہوئے جگر میں وہ خنجر کدھر گئے
تھے جو خلش فروش۔ وہ نشتر کدھر گئے
برجِ سخن کے وہ مہ و اختر کدھر گئے
وہ ہونٹ تھے جو برگِ گلِ تر کدھر گئے
محوِ سکوت ہے لبِ رنگیں نوائے داغ
پھولوں میں اب ہو داغ کے بوئے قبائے داغ

سانچے میں وہ ڈھلی ہوئی تقریر کیا ہوئی
جذباتِ حسن و عشق کی تصویر کیا ہوئی
وحشت فزا جنوں کی وہ تاثیر کیا ہوئی
طوقِ گلو کدھر گیا۔ زنجیر کیا ہوئی
زلفِ سخن کا آہ! وہ دیوانہ کیا ہوا
پریاں کدھر گئیں۔ وہ پریخانہ کیا ہوا

سونپا زمیں میں کس مہِ اوجِ کمال کو
چھوڑ آئے لوگ دشت میں کس غزال کو
ٹھکرا کے کس نے شیشۂ بزمِ خیال کو
توڑا طلسمِ عشوہ و غنج و دلال کو
پریوں کا ایشیا کی وہ جھرمٹ کدھر گیا
بندِ نقاب کیا ہوئی۔ گھونگٹ کدھر گیا

یہ کس کے ساتھ رونقِ باغِ سخن گئی
سنبل کے پیچ۔ تازگیٔ یاسمن گئی
کلیوں کی شان۔ پھولوں کی دلکش پھبن گئی
رعنائیِ عروسِ بہارِ چمن گئی
وہ ایشیا کا آہ! چمن زار کیا ہوا
پھولوں کا پھول داغ وفادار کیا ہوا

کملا گئے حدیقۂ بزمِ سخن کے پھول
کچھ رہ گئے جھڑے ہوئے باقی دہن کے پھول

مرقد پہ آہ! داغِ غریب الوطن کے پھول   لے چل! صبا! چڑھانے کو دو یاسمن کے پھول
گلگوں کفن ہے جلوۂ صبحِ بہارِ داغ
چل کر کریں دکن میں طوافِ مزارِ داغ

ہاں! او فروغِ داغ جبینِ نیازِ عشق   تیرے بغیر کون اٹھائے گا نازِ عشق
کس برج میں ہو تو مہِ جلوہ طرازِ عشق   لالہ میں کیا ہے داغِ غمِ جاں گدازِ عشق
کس حورِ عیں کی بزم میں ہے گل فروشِ داغ
تو خلد میں ہے۔ اور ترے پھولوں میں جوشِ داغ

مضمونِ حسن و عشق کے او ترجمان چہک   بزمِ سخن میں داغِ فصیح البیان چہک
اے ہمصفیرِ طوطیِ خلد آشیاں چہک   مطلع یہ اپنا بلبلِ ہندوستاں چہک
”کس نے کہا کہ داغِ وفادار مر گیا“
”وہ ہاتھ مل کے کہتے ہیں کیا یار مر گیا“

زلفِ عروسِ بندشِ مضموں کدھر گئی   نیچر کی شوخیِ قدِ موزوں کدھر گئی
وہ موجِ جنبشِ لبِ گلگوں کدھر گئی   سیلِ سرشکِ دیدۂ پرخوں کدھر گئی
ڈوبے ہوئے لہو میں وہ پیکاں کدھر گئے
وہ زخم کیا ہوئے۔ وہ نمکداں کدھر گئے

اے عمرِ رفتہ! تو ہی بتا کچھ نشانِ داغ   کس راہ سے عدم کو گیا کاروانِ داغ
نرگس میں بوئے داغ نہ لالہ میں شانِ داغ   ہے ہے! کدھر گیا چمنِ بے خزانِ داغ
وہ پھول کیا ہوئے۔ وہ چمن زار کیا ہوا
کلیاں کدھر گئیں۔ وہ سمن زار کیا ہوا

وہ سروِ نازِ رونقِ بستاں کدھر گیا   وہ تختہ بندِ سنبل و ریحاں کدھر گیا

ویراں چمن ہے ۔ مرغِ غزلخواں کدھر گیا
خاموش بزم ہے ۔ وہ سخنداں کدھر گیا

وہ شوخیِ ادائے تکلم کہاں گئی
جو نطق کی پری تھی ۔ کدھر وہ زباں گئی

وہ ایشیا کا مرغِ چمن زاد کیا ہوا
وہ عندلیبِ گلشنِ ایجاد کیا ہوا
وہ درسگاہِ عشق کا استاد کیا ہوا
کہتے تھے جس کو داغ ۔ وہ ناشاد کیا ہوا

پہلو میں اب وہ درد ہے جو پہلے داغ تھا
اب ہے جگر کا داغ جو گھر کا چراغ تھا

او ! یادگارِ ذوقِ معانی طرازِ نظم
کرسی نشیں کہاں ہے تو او نقشِ نازِ نظم
اُٹھتے ہی تیرے ہو گیا خاموش سازِ نظم
اک تیرے دم سے داغ تھا سوز و گدازِ نظم

محفل میں اک چراغِ کہن تھا ۔ سو بجھ گیا
پہلو میں ایک داغ کہن تھا ۔ سو بجھ گیا

اردو کے باغ میں گلِ رنگیں ادا تھا ایک
سارے چمن میں بلبلِ رنگیں نوا تھا ایک
داغوں میں داغِ عشق کا لذت فزا تھا ایک
تاجِ سخنوری میں دُرِ بے بہا تھا ایک

بن کر وہ چشمِ دہر سے آنسو ٹپک گیا
اے دل ! ٹپک ! کہ داغِ وفا خو ٹپک گیا

کس کی لحد پہ آہ ! چراغِ سحر ہے تو
پھولوں میں کس غریب کے داغِ جگر ہے تو
وہ چرخ کس زمیں پہ ہے جس کا قمر ہے تو
برجِ سخن کے اوجِ مہِ کامل ! کدھر ہے تو

خالی کا چاند ہے ترے غم میں ہلالِ عید
ماتم نشیں ہے لیلیِ شامِ وصالِ عید

او نقش بندِ پیکرِ حسنِ مقالِ نظم
او غازہ ریزِ شاہدِ رنگیں جمالِ نظم

او بلبلِ حدیقۂ سحرِ حلال نظم — او ماہتابِ اوجِ سپہرِ کمال نظم

کس برج میں ہے تو۔ تری منزل کدھر ہے آہ
جس دل میں داغِ عشق ہے وہ دل کدھر ہے آہ

لالہ میں ہے کہ ہے ہر کمال میں داغ تو — ہے کس کی بزمِ ناز کا آخر چراغ تو
چھلکا مئے سخن کے نہ بھر کر ایاغ تو — او آسماں! بہت نہ دکھا سبز باغ تو

اے صرصرِ زمانہ! نہ داغوں پہ داغ دے
جو بجھ گئے۔ وہ بزمِ سخن کے چراغ دے

داغ و امیر کے لبِ اظہار بھیج دے — نطقِ فصیح و شوخیِ گفتار بھیج دے
تاجِ سخن کے گوہرِ شہوار بھیج دے — منگواتی ہے نظام کی سرکار بھیج دے

ان موتیوں کو خاکِ دکن کیا کرے گی تو
کس پر نثار یہ درِ یکتا کرے گی تو

سوتے ہیں ایک برج میں زیرِ مزار حیف — دو مہر و ماہ اوجِ سخن کے ہزار حیف
دو خاک میں نہاں ہیں درِ آبدار حیف — گلگوں کفن ہیں دو گلِ رنگیں بہار حیف

دہلی کا ایک پھول ہے اک لکھنؤ کا پھول
لالہ کا ایک پھول ہے اک ناز بو کا پھول

سرور جہان آبادی

تازہ غزلیں

ہمارے کرمفرما جناب احسن صاحب مارہروی نے حضرت داغ مرحوم کی دو غیر مطبوعہ غزلیں عنایت کی ہیں جو ذیل میں درج ہیں

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم — دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم
جنت میں جائیں ہم کہ جہنم میں جائیں ہم — مل جائے تو کہیں نہ کہیں تجھ کو پائیں ہم
جورِ فلک میں خاک بھی لذت نہیں رہی — جی چاہتا ہے تیری جفائیں اٹھائیں ہم
ڈر ہے نہ بھول جائے وہ سفاک روزِ حشر — دنیا میں لکھتے جاتے ہیں اپنی خطائیں ہم
ممکن ہے یہ کہ وعدے پر اپنے وہ آ بھی جائے — مشکل ہے یہ کہ آپ میں اُس وقت آئیں ہم
ناراض ہو خدا تو کریں بندگی سے خوش — معشوق روٹھ جائے تو کیونکر منائیں ہم
سر دوستوں کے کاٹ کے رکھتے ہیں سامنے — غیروں سے پوچھتے ہیں قسم کس کی کھائیں ہم
کتنا ترا مزاج خوشامد پسند ہے — کب تک کریں خدا کے لئے التجائیں ہم
یہ اور کوئے یار کا چکر زہے نصیب — لیتے ہیں اپنے پاؤں کی اکثر بلائیں ہم
لالچ عبث ہے دل کا تمہیں وقتِ واپسیں — یہ مال وہ نہیں کہ جسے چھوڑ جائیں ہم
تاثیر کو سلام کریں دونوں ہات سے — جس وقت اپنے ہات دعا کو اٹھائیں ہم
سونپا تمہیں خدا کو۔ چلے ہم تو نامراد — کچھ پڑھ کے بخشنا جو کبھی یاد آئیں ہم
یہ جان تم نہ لو گے اگر آپ جائے گی — اِس بے وفا کی خیر کہاں تک منائیں ہم
ہمسائے جاگتے رہے نالوں سے رات بھر — سوئے ہوئے نصیب کو کیونکر جگائیں ہم
مانو کہا جفا نہ کرو تم وفا کے بعد — ایسا نہ ہو کہ پھیر لیں اُلٹی دعائیں ہم
دشمن سے ملتے جلتے ہیں خاطر سے دوست کی — کیا فائدہ جو دوست کو دشمن بنائیں ہم
تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ — اے داغ کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

صبح میں تکرار باقی رہ گئی — کچھ کسر ہر بار باقی رہ گئی
جلوۂ دیدار نے بیخود کیا — حسرتِ دیدار باقی رہ گئی
خط کتابت سے تو نکلا کچھ کام — نوبتِ گفتار باقی رہ گئی
اسکو بھی اچھا کر اے مسیح — نرگسِ بیمار باقی رہ گئی
مرحلے طے عشق کے اکثر ہوئے — منزلِ دشوار باقی رہ گئی
شوق نظارہ وہاں لے تو گیا — پھاندنی دیوار باقی رہ گئی
حلق میں تھا نازِ آہن گداز — کیا تری تلوار باقی رہ گئی
عشق کے زیرِ حکومت سب ہے — کونسی سرکار باقی رہ گئی
دل میں کیا چھوڑا ابھی غم نے ترے — کچھ ہوس اے یار باقی رہ گئی
داغ کا دل ہوگیا دنیا سے سرد — گرمیِ اشعار باقی رہ گئی

مجرب — فیصلہ جناب مسٹر جے جی سلکاک صاحب بہادر سابق ڈپٹی کمشنر لودیانہ حال کمشنر راولپنڈی — مجرب

تریاقِ طاعون

ہم نے عرصہ دراز کی جانفشانی کے بعد تریاقِ طاعون ایجاد کیا ہے جو تجربہ سے نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ بطور حفظ ماتقدم اگر استعمال کیا جائے تو مرض طاعون کے حملہ سے انسان محفوظ رہتا ہے۔ اگر مبتلائے مرض اس کا استعمال کرے تو فوراً بخار فرو ہو جاتا ہے۔ گلٹیاں گم ہو جاتی ہیں۔ دل میں طاقت طبیعت میں بشاشت آجاتی ہے۔ اس دوائی کے استعمال سے نہ قے آتی ہے نہ اسہال ہوتے ہیں۔ پسینہ جو مرض طاعون کے لئے بڑی نیک نشانی ہے۔ آجاتا ہے۔ اور مریض بفضل خدا صحت یاب ہو جاتا ہے۔ ہر ایک گھر میں چند شیشیاں تریاق طاعون کی موجود رہنی چاہئیں۔ تجربہ اس امر کی کافی شہادت ہے کہ تریاقِ طاعون تحصیل قصور ضلع لاہور میں شروع مرض میں اٹھانوے آدمیوں نے استعمال کیا۔ جن میں سے ۹۰ صحت یاب ہوئے۔ اور صرف آٹھ آدمی فوت ہوئے۔

قیمت فی شیشی (عہ) چھ شیشی (صہ) بارہ شیشی نو روپے (لعہ) محصول ڈاک ذمہ خریدار۔

نقل چٹھی نمبری ۲۴۵

از جانب جناب مسٹر جے جی سلکاک صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر لودیانہ (حال کمشنر راولپنڈی) مورخہ ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۰۴ء۔ جناب من بجواب آپ کی چٹھی مورخہ ۳۱ ماہ گذشتہ در بارہ تریاق طاعون میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ جن میونسپل کمشنران کو یہ دوائی بھیجی گئی تھی۔ انہوں نے اس کی نسبت عمدہ رپورٹ کی ہے۔ اور چونکہ ان کے بیان کے مطابق شہر لودیانہ میں اس کی مانگ بہت ہے۔ اس لئے بہت اچھا ہوگا کہ انہیں ممبروں کے پاس مفت تقسیم کرنے یا فروخت کے لئے کچھ اور دوائی بھیجدیں۔

دستخط

صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر

چورن شاہی

شربت ... [illegible]

منجن مقوی دندان

جوہر عشبہ

حبوب قبض

حبوب بواسیر

المشتہر حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر پروپرائٹر شفاخانہ عام لاہور

ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر ڈبلیو آر کرائیبر صاحب بہادر - ایف

سی - ایس - اے - آر - ایس - ایم - فیلو آف کمسٹری لندن

جسکی نسبت لندن و کلکتہ و پنجاب آگرہ میڈیکل کالج کے سندیافتہ معزز ڈاکٹروں و نوابوں راجاؤں کے معزز حکیموں صاحبان جج بہادر و مجسٹریٹ بہادر و صاحبان ڈپٹی کلکٹران بہادر و معزز لیڈین صاحبان انگریز بہادر وغیرہ نے بعد تجربہ و استعمال کے ہم کو یہ لکھا ہے کہ آپ کا ممیرہ و سچے موتیوں کا سفید سرمہ آنکھوں کی بیماریوں و ترقی روشنی کے واسطے بہت مفید اور سب سے بہتر و زود اثر دوا ہے - کہ جس کے سارٹیفکیٹ بوقت فرمائش آپ کی خدمت میں ہم خود بھیجیں گے - تمام ملک روس وغیرہ کے معزز ڈاکٹران و حکیم آنکھوں کی بیماریوں میں اور دوا کو چھوڑ کر ہماری اس دوا کو استعمال کرتے ہیں - ہم نے اصلی عمدہ ممیرہ بڑی تلاش سے ہندوستان کے باہر سے منگایا ہے -

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اس میں جلد کامیابی

(۱) نگاہ ناپ کر ہمارا سرمہ لگائیے دو ہفتے میں روشنی آنکھ بہت بڑھ جائیگی اور آنکھ کے جملہ نقص دور ہو جائینگے (۲) عینک کی ضرورت نہیں - (۳) دھند - ڈھلکہ - آنسو بہنا - سردی - سوزش - کھجلی - آنکھ کے سامنے کا اندھیرا پلکوں کے اندر کے دانے و سرخی - گوہانجی (۱۲) لکھنے پڑھنے سے آنکھوں کا تکان - درد بہت جلد شرطیہ دفع کرتا ہے - (۱۴) کمزور نگاہ سے سوئی میں تاگا بہت جلد چھوڑ لیجئے - پڑوال بیل - جالا - پھولی - ابتدائی موتیابند - ناخونہ - ککرے (۲۲) آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑ جانے کو (۲۳) پلکیں گر جانے والی بیماری کو مفید ہے - کمزور آنکھ کو قوت دیتا ہے - آنکھوں کا میل اور مواد صاف کرتا ہے اور جملہ امراض سے محفوظ رکھتا ہے -

قیمت فی تولہ تین روپے - اپنا نام و مقام و نام ڈاکخانہ و ضلع خوشخط لکھو ورنہ تعمیل نہ ہوگی -

المشتہر - رام سرن نگم - کانپور

چند معزز اور قابل قدر و لائق اطمینان شہادتیں

(۱) عالیجناب ڈاکٹر ای - والی سورٹر صاحب بہادر آر ڈی - ایم بی - ایل - لنڈن -

(۲) جناب ڈاکٹر ایچ - پی - بنرجی صاحب ایل - ایم ایس سرجن کلکتہ -

(۳) جناب ڈاکٹر پی - این بنرجی صاحب ایل - ایم ایس اسسٹنٹ سرجن میرٹھ -

(۴) جناب ڈاکٹر اللہ یار خانصاحب ایس - جی بی سپٹل اسسٹنٹ ضلع بجنور -

(۵) جناب ڈاکٹر عبدالصمد خانصاحب ہاسپٹل اسسٹنٹ ضلع کانپور -

(۶) عالیجناب شمس العلما خان بہادر جناب مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب پروفیسر سابق میور کالج الہ آباد

(۷) جناب مولوی فصیح الدین احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر اسسٹنٹ مہتمم بندوبست کانپور -

(۸) میر حمزہ حسین صاحب بی - اے - بی - ایل سب جج بہادر مقام منگلور

(۹) عالیجناب مولوی سید حامد صاحب منصف درجہ اول ضلع ہمیر پور -

(۱۰) عالیجناب منشی جعفت اللہ صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر ضلع بستی

(۱۱) عالیجناب مسٹر بن بہاری صاحب کمرجی ایم - اے ایل ایل - بی سیشن جج بہادر گونڈا -

(۱۲) عالیجناب مسٹر نبل دھبہ صاحب بی - اے - بی - ایل جج خفیف بہادر مقام منڈگیر

(۱۳) عالیجناب مسٹر شیکرلال صاحب بستی مجسٹریٹ بہادر مقام منڈگیر

(۱۴) عالیجناب مسٹر جی ڈی - بی صاحب بہادر آنرری وسٹرکٹ منسٹری کانپور -

(۱۵) عالیجناب جی باگ صاحب بہادر انجنیر ریلوے